بمبئی کی الف لیلیٰ

آغا اشرف

مکتبہ چودھویں صدی
چوک اردو بازار — لاہور

ناشر :-

بار اول :- ایک ہزار ۱۰ مئی

قیمت :- روپے

فیاض پبلیشرز چوک اردو بازار لاہور

اس کتاب کے تمام کردار فرضی ہیں

ہندوستان کے منفرد ہدایت کار، ایشیا کے سب سے
بڑے سناریواسٹ

اور

اپنے گرو دیو جے۔ کے۔ نندہ کے نام

ایم اے زاہد کے جذباتی ناول

پیرس کی راتیں	۳/-
ہانگ کانگ	۴/-
لاہور رات لڑکی	۶/-
دیوانوں کی بستی	۴/-
روشنیوں کا شہر	۶/-
لندن کی شام	۶/-
نائٹ کلب	۱۰/-
ٹھنڈا خون	۴/-
اس رات کا درد	۱۰/-
تھیٹر کی ہیروئن	۶/-

ترتیب

اوپن کلوز
ڈکن کوئین میں سیفٹی ریزر
نگار خانے صنم خانے۔
اندر سبھا
فلمی باون گزے
مہورت
سلولائیڈ کی سلوچنا
عشق پہ زور نہیں
بمبئی کے ہینگنگ گارڈن
بلو پرنٹ
اندھیرا اجالا
انٹرویو
فلمی کوک شاستر
ہنگامہ
بمبئی کی قلوپطرہ
محبت گرم گرم آنسو
ارٹن کھٹولا
سائن ہسپتال میں

سمندر

ساحل

سیپ

گاڑی اب کلیانی سے چھوٹ چکی تھی اور فراٹے بھرتی بمبئی کی طرف چلی جارہی تھی۔ جو وہاں سے صرف بیس میل دور رہ گیا تھا بمبئی میں پینے کا پانی پائپ لائن کے ذریعے کلیانی ہی سے آتا ہے سمندر کا پانی کھاری ہوتا ہے اس لئے بمبئی کی آبادی پینے کے لئے اسے استعمال نہیں کرتی۔

میں گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکالے ہوئے تھا کیونکہ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھا مارواڑی ایک سیٹھ رہ رہ کر گیس چھوڑ رہا تھا

جس سے میرا جی متلانے لگا تھا۔ کھایا پیا اچھل اچھل کر اوپر آ رہا تھا۔ جیسے ابکائی ابھی آئی کہ آئی۔

سویرا ہو رہا تھا۔ گاڑی اب سمندر کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی۔ جس سے میرا جی متلانے لگا تھا۔ کرشنا۔ کاویری اور گوداوری جیسے ہندوستان کے چھوٹے بڑے دریا اور دوسرے ندی نالے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنگم بنائے ہوئے تھوڑی دور جا کر سمندر میں گرتے دکھائی دے رہے تھے۔ گاڑی ان پر بنے ہوئے پلوں پر سے گزر رہی تھی۔

دہلی سے آگے نکلتے ہی گاڑی کی لائن کے دونوں طرف پہاڑیوں کا سلسلہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دھرتی سے پتھر کے سینگ نکل رہے ہیں۔ لیکن متھرا کے قریب دس میل کے فاصلے پر ادھر ایک اسٹیشن ہے بھتیشور۔

بھتیشور شیو شنکر پاربتی جی کے پتی کے بہت سے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس اسٹیشن پر پہنچ کر یہ پہاڑیاں پتھر کے سینگوں سے بڑے بڑے ستون بنتی چلی جاتی ہیں اونچی اونچی یہ چٹانیں کہیں بھوری، کہیں نیلی، کہیں پیلی پیلی۔

یہ چٹانیں یہ پہاڑیاں اراولی پربت کا عظیم سلسلہ ہیں جو

دلی سے لے کر بمبئی تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جب گاڑی ریاست بھوپال میں سے گزرتی ہے تو یہ پہاڑیاں بڑی ہیبت ناک شکل اختیار کر لیتی ہیں جنہیں کاٹ چھانٹ کر ریلوے لائن بنائی گئی ہے ہندوستان کا یہ وہ حصہ ہے جہاں سے سنٹرل انڈیا کے جنگلات گھنے گنجان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں چشمے، کہیں دریا، کہیں ندی نالے ابھی گاڑی ینچان میں چلی جا رہی ہے تو ابھی چکر کاٹتے ہوئے کسی اونچی پہاڑی پر چلنے لگتی ہے۔ یہاں گاڑی کو دو انجن دھکیلتے ہیں۔ ریاست بھوپال میں ایک جگہ دریا آتا ہے۔ جس کے دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے دو اسٹیشن ہیں۔ جہاں سے گاڑی کو ایک انجن اور لگا دیا جاتا ہے ادھر آتے ہوئے بھی اور ادھر جاتے ہوئے بھی۔ کیونکہ یہاں پہاڑیاں کافی اونچی ہیں ان کو کاٹ کر ریل کے لئے جو راستہ بنایا گیا ہے۔ وہ کافی بلندی پر ہے دو انجن گاڑی سے آگے پیچھے اس لئے لگا دیئے جاتے ہیں کہ گاڑی کو کھینچ کر آسانی سے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیں۔ سنٹرل انڈیا کے جنگل اتنے گھنے گنجان ہیں کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافر کھڑکیوں سے طرح طرح کے جانور جنگل میں ادھر ادھر بھاگتے دیکھتے ہیں، چیتل، نیل گائے پاڑے، ہرن، جنگلی بکرے، گیدڑ، بھیڑیئے، چرخ اور کبھی کبھی تو

چیتا یا شیر بھی جنگل میں بھاگتا نظر آجاتا ہے۔

بمبئی جانے کے لئے دو ریلوے لائنز ہیں۔ بی بی اینڈ سی آئی آر، بمبئی، بڑودہ اور سنٹرل انڈیا ریلوے اور دوسرا راستہ ہے آگرہ جھانسی، بھرت پور، دیتا اور للت پور وغیرہ

اِدھر سے جو ریلوے لائن نکلتی ہے اسے جی آئی پی کہتے ہیں گریٹ انڈین پینسولا ریلوے۔

میں ان دونوں راستوں سے کئی بار بمبئی آیا گیا ہوں۔ جی آئی پی کا راستہ بھی خوب ہے۔ گاڑی مختلف ریاستوں میں سے ہو کر بمبئی پہنچتی ہے اور دوسرے راستے میں بھی بڑودہ بھوپال، گوالیار، ایسی بڑی ریاستیں راستے میں آتی ہیں۔ مجھے یہ راستہ بڑا پسند تھا۔ سین سینریوں کے اعتبار سے یہ راستہ بڑا ہی دلکش و دلفریب ہے متواتر تین دن سے گاڑی میں بیٹھا ہوا مسافر اکتاتا نہیں تھا۔ اور وہ گاڑی بھی بڑی ہی شاندار اور تیز رفتار تھی۔ جو اسی راستے سے گزرتی تھی پرائڈ آف پشاور تھا اس کا نام ــــ اسے خیبر میل بھی کہتے ہیں جو پشاور سے سیدھی بمبئی جاتی تھی۔ سنٹرل انڈیا کے گھنے گنجان جنگلوں میں پہنچ کر یہ گاڑی چونکہ بڑی تیز رفتار ہو جاتی تھی اس لئے اس کو کوئین آف جنگل بھی کہتے تھے۔ ایک گاڑی اور اس

کے تین نام -

ہاں تو یہ پہاڑیاں جو دلی سے لے کر بمبئی کے ساحل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کلیانی سے آگے نکل کر بڑی ہی دلکش و دلفریب ہو جاتی ہیں۔ خاص کر وہ مقامات جہاں دریا، سمندر میں گرتے ہیں یہ پہاڑیاں ادھر ادھر کٹ جاتی ہیں۔ اور ان کے بیچ میں سے دریا گزرتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے چوکھٹے میں میں کوئی سینری جڑی ہوئی ہے۔

سی اسکیپ —— اوپر نیلا نیلا آسمان — نیچے نیلا نیلا سمندر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سمندر کون سا ہے اور آسمان کون سا؟ پہاڑیوں کے دو رویہ کٹ جانے سے سمندر اور آسمان کے درمیان ایک عجیب پُر اسرار نیلا خلا پیدا ہو جاتا ہے پہاڑیوں کے اوپر ناریل کے لانبے لانبے ہرے ہرے درخت سمندری ہواؤں سے جھولتے دکھائی دیتے ہیں اور دریا کی دھارا سمندر میں جذب ہوتے ہوئے نیلی سی ایک لکیر کھینچتی چلی جاتی ہے۔ نیلے نیلے پھیلاؤ میں جس میں ماہی گیروں کی لانبے لانبے بادبانوں والی کشتیاں جھکولے کھاتی چلی جاتی ہیں۔

میں گاڑی سے سر باہر نکالے بڑی دلچسپی سے ان نظاروں کو دیکھ رہا تھا۔ بمبئی دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ میں ان نظاروں

سے اتنا متاثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں جاگتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔

نیلا آسمان۔ سمندر۔ ساحل۔ ناریل کے لانبے لانبے ہرے ہرے سمندری ہواؤں سے جھولتے درخت مجھے سپنے دکھائی دے رہے تھے۔ جن کا فقط ایک رنگ تھا۔ گہرا نیلا رنگ۔ اور ناریل کے ہرے ہرے درخت جیسے اس نیلے رنگ میں بکھرے ہوئے چھینٹے سے اور پھر آفتاب سمندر کے عمق سے ابھرا تو ایک اور رنگ نے جنم لیا۔ سرخ نارنجی رنگ جس نے گہرے نیلے اور ہرے رنگ میں گھل مل کر ایسا جادو جگایا۔ کہ وہ جو گاڑی میں پڑے گہری نیند سو رہے تھے جاگ پڑے۔ گاڑی میں ہر طرف یہی شور سنائی دینے لگا۔

بمبئی آگیا — بمبئی آگیا —

بمبئی سپنوں کا جزیرہ !!

وکٹوریہ ٹرمینس

بمبئی شہر کے انیس۱۹ اسٹیشن ہیں جن میں سب سے بڑا بوری بندر ہے جسے وکٹوریہ ٹرمینس بھی کہتے ہیں۔

وکٹوریہ ٹرمینس !!

جہاں ریلوے لائن ختم ہو جاتی ہے۔ خشکی ختم ہو جاتی ہے آگے بس سمندر ہے۔ جس کے کنارے کنارے بمبئی شہر لمبائی میں میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور اب تو سنا ہے جوڑائی میں بھی اتنا ہی پھیل گیا ہے ادھر کلیانی اور ادھر گورے گاؤں تک اس کی آبادی پھیل چکی ہے۔

وکٹوریہ ٹرمینس پر اس وقت بڑی بھیڑ ہو رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ گورے کالے ملکی غیر ملکی سبھی طرح کے لوگ وہاں دیکھنے میں آ رہے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا کا گاروبلی مچی ہوئی تھی۔ کہیں سواریوں کا شور کہیں چھابڑی والوں کا۔ مسافروں سے زیادہ قلی جلدی میں تھے۔ جس ڈبے میں میں بیٹھا ہوا تھا سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ لیکن ٹکٹ میرے پاس انٹر کا تھا۔ دلی سے لے کر بمبئی تک کوئی ٹکٹ چیکر اس ڈبے میں نہ آیا۔ اور اگر آ بھی جاتا۔ تو جو ہوتا دیکھا جاتا۔ اتنے لمبے سفر میں مجھے ٹکٹ چیکر کے خیال نے کہیں بھی پریشان نہ کیا۔ اور ان دنوں دل ہی ایسا تھا اپنے پہلو میں کہ پریشان ہونا تو جانتا ہی نہ تھا۔

سواریاں ایک ایک کر کے ڈبے سے اتر تی چلی گئیں۔ لیکن میں نہ اترا۔ باہر بھیڑ تھی۔ میں نے دل میں کہا یہ ریل پیل ذرا ہلکی ہو جائے تو بڑے ٹھاٹ سے باہر نکلوں گا۔ ہیرو بننے آئے ہیں مونگ پھلی بیچنے نہیں آئے۔ کھڑکی سے سر باہر نکالے سگریٹ کا دھواں ہوا میں اڑاتا رہا۔

اتنے میں ایک پٹاخہ سی لڑکی۔ چاکلیٹ بار آئس کریم، بھیڑ میں دھکا پیل کرتی میری طرف بڑھی اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر

مجھے پورا وکٹوریہ ٹرمینس ہی گلاب کا ایک پھول نظر آنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں مسکراہٹ کا ڈبل کوٹ کیا ہوا ہے۔ اور میرا کوٹ جسم پر ڈھیلا ہو گیا۔

"او مائی ڈارلنگ ۔۔۔ دلجیت ۔ مائی سوئیٹ ۔۔۔" یہ اس لڑکی کی آواز تھی۔ جیسے کسی نے ہارمونیم باجے کا دوسرا کالا سُر چھیڑ دیا ہو۔ اس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے اگر وہ ایک بار مجھے اسی سنگیت میں بلاتی تو شائد میرے قمیض کے کالر کے دونوں کناروں پر بھی کھڑے ہو جاتے۔ اور میں خود گاڑی کی سیٹ سے اٹھ کر اس کی کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا مگر فوراً ہی اس لڑکی کی آواز جیسے بیٹھ گئی۔

"اوہ ۔۔۔ ! ایکس کیوز می ۔۔۔"

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں اس کا دلجیت ۔۔ اس کا ڈارلنگ ۔ اس کا ــــــ اس کا سوئیٹ۔ اور نہ جانے کیا نہیں تھا وہ یکدم سیریس ہو گئی۔ لیکن میں نے جلدی سے ادھر سے ایک چٹکلا سرکا دیا۔ کہ وہ جلدی سے کہیں ادھر نہ سرک جائے میں نے کہا۔

"مادام! اسلئے آپ چند لمحوں کے لئے مجھے ہی ڈارلنگ ہو

لیجئے اس سے آپ کی بوکھلاہٹ اور میری بوریت ختم ہو جائے گی جو سفر کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکراتی ہوئی ساتھ والے ڈبے کی طرف سرک گئی۔ اور میں نے دل میں کہا۔

"اچھا شگون ہے۔"

اور پھر میں نے بمبئی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دل میں کہا۔

"شکریہ ایشیاء کے حسین ترین شہر، تو نے میرے استقبال کے لئے اپنے بہترین گیتوں میں سے ایک گیت پیش کیا۔"

اتنے میں ایک قلی ڈبے میں گھس آیا اور مجھے پوچھے بغیر میرا صندوق اور اس پر دھرا بستر، برتھ پر سے اٹھا کر گاڑی سے باہر نکل چلا وہ سکھ جوان تھا۔ پنجاب کا رہنے والا۔ میں نے اس سے پنجابی میں کہا۔

"سردار جی کتھے۔ ایہہ کدھر لے چلے او"؟

وہ وہیں رک گیا۔ بولا

"بابو جی ایہہ تے تسیں دسو گے۔ میں تے تہاڈا سامان چک لیا اے۔ ہن گڈی خالی ہو گئی اے تسیں ایتھے بیٹھے خبرے قلی کوئی ویکھ رہے او"۔

اور میں خاموش رہا۔ وہ میرا سامان لے کر گاڑی سے باہر نکلا تو میں بھی جلدی سے باہر نکل آیا۔ بھیڑ ابھی تک کم نہ ہوئی تھی سب لوگ قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ میں بھی سردار جی کے پیچھے پیچھے قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

میری نظریں دائیں بائیں اوپر نیچے وکٹوریہ ٹرمینس کی ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

وکٹوریہ ٹرمینس !

جس کی ہر چیز مجھے نہ جانے کیوں اچھی لگ رہی تھی۔

کشتوری

بھیڑ ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں بدستور سردار جی کے پیچھے پیچھے قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اسٹیشن سے باہر نکلنے کا دروازہ ابھی کافی دور تھا۔ اتنے میں پہلے کشتوری کی خوشبو آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز۔

"بابوجی ــــ! کشتوری لے لو ــــ"

میری بغل سے ایک گھاٹن لڑکی نکل کر میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"بابوجی کستوری لے لو ـــ" گھاٹن لڑکی نے پھر کہا۔

میں نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں کستوری کے نافے تھے اور کندھے سے کپڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ جس میں نہ جانے کیا کچھ تھا۔ لڑکی کی رنگت بھی کستوری ایسی تھی۔ کھال چمکیلی، اس کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے اندھیری رات میں دو دیپ۔ ماتھے پر سیندور کا قشقہ، لانبے لانبے کالے بال کھلے کھلے بہے بہے۔ وہ نے سفید ململ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی جس میں سے اس کے ترشے ہوئے جسم کا ایک ایک خط نمایاں نظر آرہا تھا۔ پاؤں ننگے۔ پیارے پیارے پاؤں۔ جیسے ریت میں سیپ

میں نے آواز دے کر قتلی کو کھڑا کرنا چاہا لیکن وہ ادھر بھیڑ میں پھنسا ہوا تھا۔ یہاں اب مسافروں کی ایک لمبی سی قطار بن گئی تھی، جو اسٹیشن سے باہر نکلنے کے لئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں قتلی کو آواز دیتے دیتے رک گیا کہ چلنے دو قدم قدم سردار جی کو، کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔

"لے لو۔ لے لو بابو کستوری ـــ" گھاٹن لڑکی پھر بولی

"کتنی قیمت؟" بےساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"پانچ روپیہ ـــ" گھاٹن لڑکی آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔

"اور تمہاری قیمت ——!" میں نے مذاقاً کہا۔

جس کے جواب میں وہ کھی کھی ہنسنے لگی۔ تو میری دائیں طرف کھڑا پتلا دبلا گجراتی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے مجھے کوئی غیر ملکی جاسوس سمجھ رہا ہو

"نکالو بابو —— پیسے نکالو —" گھاٹن لڑکی نے کستوری کا نافہ مجبوراً میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"کستوری اور اتنی سستی" میں نے گھاٹن لڑکی سے کہا

"پانچ روپے میں نافہ ۔کستوری تو کم سے کم اسّی روپے تولہ ملتی ہے۔"

"بامبی میں بڑی سستی ہے کستوری بابو —— روپے نکالو روپے تم بڑے اچھے بابو۔" گھاٹن لڑکی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کستوری کے نافے میں بند ہو گیا ہوں۔ یہ اس کی آنکھوں کا جادو تھا۔

"کستوری اصلی ہے یا نقلی ——" میں نے پھر مذاقاً کہا۔

"اصلی والا بابو بالکل اصلی والا ——" اب آنکھوں کے ساتھ گھاٹن لڑکی نے اپنی تنی ہوئی چھاتیاں بھی مٹکائیں تو میرا ہاتھ خود بخود جیب میں سرک گیا۔ اچھی ایکٹنگ دکھا رہی تھی۔ گھاٹن لونڈیا اور

میں ایکٹر تھا۔ اب جو گھاٹن لونڈیا نے بھنویں تانتے ہوئے آنکھوں کے ساتھ اپنے کولہے مٹکائے تو بس میرا مستک گھوم گیا۔ میں نے پانچ کی بجائے دس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور وہ کھی کھی ہنستے ہوئے خوشی خوشی ایک طرف نکل گئی۔

گھاٹن لونڈیا نہیں کشتوری ——

نافہ —— مرگ نینی لڑکی —— گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی گھاٹن ——

میں نے دل میں کہا۔ اچھا شگون ہے۔ میری شہرت کشتوری کی طرح پھیل جائے گی بمبئی میں۔

کیوڑے کے پھول

دروازے کے راستے پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے قلی نے میرا سامان پورٹیکو میں رکھ دیا جہاں اور بھی بہت سے مسافر بمبئی کے ہوٹلوں اور ریستورانوں کے ایجنٹوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اپنے ہوٹل یا ریستوران کا نام بتاتے ہوئے اس کی خوبیاں بتا رہے تھے۔ اپنے گاہک پھنسا رہے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے گھیرنے کی کوشش کی لیکن میں نے سب کو یہی جواب دیا۔ کہ میں ہوٹل میں نہیں اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہروں گا۔ ایک کے بعد ایک وہ سب جھڑتے چلے گئے لیکن

یہاں آتے ہی میں بالکل بور ہو گیا ان کے ساتھ مغز ماری کرتے ہوئے۔ لیکن یہ بوریت فوراً ہی ختم ہو گئی۔ ایک گجراتی لونڈیا ٹوکری میں کیوڑے کے پھول لے کر آ گئی۔ اور وہ خود نرگس کا پھول تھی۔ پتلی دبلی۔ زرد زرد رنگت۔ کھلے کھلے سے گیسو۔ آنکھیں بھی نرگس بیمار۔ جو شاید کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھیں۔

کون نہیں جانتا کہ کیوڑے کی خوشبو میں جادو ہے کیوڑے کے پھول چاندنی میں کھلتے ہیں۔ اور کیوڑے کے ہر پھول کی رکھوالی ایک سانپ کرتا ہے سانپ کیوڑے کی خوشبو سے مست ہو کر شاخ سے لپٹا پڑا رہتا ہے لیکن جوں ہی کوئی کیوڑے کے پھول کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے سانپ اسے ڈس لیتا ہے اس لئے کیوڑے کے پھولوں کے قریب جاتے ہوئے ہر کوئی ڈرتا ہے اور قریب جانے کی بھی کیا ضرورت ہے کیوڑے کے پھول کھلتے ہیں تو ان کی مہک میلوں تک جاتی ہے کیوڑے کے پھولوں کو توڑنے والے سانپوں سے بچ بچا کر بڑی ترکیب سے توڑتے ہیں۔ کہ انہیں کہیں کوئی سانپ نہ ڈس جائے۔

اس سے پہلے میں نے کبھی کیوڑے کے پھول نہ دیکھے تھے۔ مکئی کے بھٹے کی طرح ہوتا ہے کیوڑے کا پھول جس میں مکئی کے دانوں اتنے پھول ہوتے ہیں۔ ننھے ننھے سفید پھول اور ان میں ہلکی ہلکی زردی

سی کھلی ہوئی ہیں نے گجراتن لونڈیا سے کیوڑے کا پھول لے کر سونگھا تو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی روح میری روح میں بس گئی ہے اور جنم جنم تک میرے ساتھ رہے گی۔ سارا ماحول مہک اٹھا تھا کیوڑے کی خوشبو سے ۔ گجراتن لڑکی سے نوک جھونک کرنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن کیوڑے کی خوشبو نے جیسے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ میرے منہ سے فقط اتنا نکلا

"کتنے پیسے ۔ ؟"

"اوروں سے چار روپے تم سے تین ۔" گجراتن لڑکی نے جواب دیا

"یہ رعایت کیوں ؟" میں نے پوچھا

"تم پردیسی ہو۔" گجراتن لونڈیا نے جواب دیا تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے اس کی نرگس بیمار آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ہیں لیکن اس نے پلکوں سے آگے نہیں نکلنے دیئے۔

پتلی دبلی کیوڑے کے پھول بیچنے والی نرگس بیمار لڑکی معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کیوڑے کے کسی سانپ نے ڈس لیا ہے جس کے زہر سے وہ مری تو نہیں لیکن زندوں میں بھی نہیں ہے۔

کیوڑے کے پھولوں کی اگر زبان ہوتی تو نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں سناتے اس زہر کی جو انسان کو اگر ھلاک نہیں کرتا تو زندوں میں بھی نہیں چھوڑتا۔

میں نے تین روپے دے کر کیوڑے کے پھول خرید لئے۔ اور گجراتن لونڈیا مجھے سلام کر کے چلتی بنی

مجھے بھنڈی بازار جانا تھا۔ وہاں میرا دوست اعجاز رہتا تھا جسے میں نے ایک ہفتہ پہلے خط لکھ دیا تھا۔ کہ میں فلاں تاریخ کو خیبر میل پر بمبئی آ رہا ہوں وہ مجھے اسٹیشن پر لینے آیا۔ لیکن ادھر ہوا یہ کہ میں ایک عزیز کی اچانک موت ہو جانے سے اس تاریخ کی بجائے گاڑی میں سوار نہ ہو سکا۔

صاف ظاہر ہے کہ میرا دوست اعجاز مجھے لینے اسٹیشن پر ضرور آیا ہو گا۔ اس نے مسافروں میں مجھے بڑا تلاش کیا ہو گا۔ گاڑی کا ایک ایک ڈبہ دیکھا ہو گا۔ اور مجھے نہ دیکھ کر اسے بڑا افسوس ہوا ہو گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ میرے متعلق اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے تشویشناک خیالات بھی گھومنے لگے ہوں۔ کہ میں کیوں نہیں آیا۔ جبکہ میں نے خط میں آنے کی تاریخ بھی لکھ دی تھی۔

میں بہت جلدی اعجاز کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ کہ اگر اسے میری طرف سے کسی تشویشناک خیال نے پریشان کر رکھا ہے تو وہ پریشانی دور ہو جائے۔

اعجاز فورٹ ایریا میں کالے گھوڑے کے پاس ایک ٹیلرنگ

شاپ میں بہترین کٹر تھا۔ اور بیس روپے روزانہ پیدا کر لیتا تھا
مجموعی طور پر جس کی کل رقم چھ سو روپے ماہوار بنتی ہے۔ میں ایک
ٹیکسی میں بیٹھ کر بھنڈی بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

سمندری ہوائیں کالی گھٹائیں

میرا دوست اعجاز بھنڈی بازار میں ایک بلڈنگ کے تیسرے ملے میں رہتا تھا۔ دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے کرایہ ایک سو بیس روپے ماہوار، اعجاز متواتر سات سال سے بمبئی میں تھا۔ اور اس بلڈنگ میں پرانا کرائے دار تھا۔

اس دن اسے کام سے چھٹی تھی۔ وہ گھر پر ہی موجود تھا مجھے مل کر بہت خوش ہوا تیسرے مالے کی ایک کھڑکی سے جھانکتے ہوئے نیچے باہر والے کو آواز دی۔

"اے باہر والا — چائے لاؤ۔"

بمبئی میں "باہر والا" چائے والے کو کہتے ہیں تھوڑی دیر میں باہر والا چائے لے آیا۔ چائے کا دور چلنے لگا۔ باتیں ہونے لگیں۔ اعجاز واقعی میرے خط میں لکھی ہوئی تاریخ پر فرنٹیئر میل میں بمبئی نہ پہنچنے پر سخت متردد تھا۔ اسے یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا۔ کہ راستے میں مجھے کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ کوئی اور بدمزگی رونما نہ ہو گئی ہو۔ میں نے اس سے معذرت چاہی اور اسے بتایا۔

"میرے اس دن گاڑی میں سوار نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک عزیز کی موت ہو گئی تھی۔ اس لئے دوسرے دن گاڑی میں بیٹھا اور آج یہاں پہنچا ہوں۔ اور تم کل اسٹیشن پر میرا انتظار کرتے رہے۔

"چلو یار یوسف تم کل نہ سہی آج یہاں پہنچ گئے۔ اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن وہ تمہارے ابا جان تو تمہیں پولیس میں نوکر کرانا چاہتے تھے۔ اور تم فلموں میں کام کرنے کا پروگرام بنائے یہاں چلے آئے ہو۔" اعجاز نے کہا

"میں سوائے فلموں میں کام کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا خدا نے مجھے اسی کام کے لئے پیدا کیا ہے تمہیں معلوم ہے مجھے بچپن ہی سے

ایکٹنگ کرنے کا شوق ہے۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے اعجاز سے کہا۔

"تمہیں یاد ہوگا۔ جب ہم اسکول سے بھاگ کر دریا کے کنارے ذخیرے میں پیڈرو بہادر کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن یار یوسف یہاں فلم میں چانس بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ بڑے بڑے حسین جوان اور حسین لڑکیاں گھر سے بھاگ کر ایکٹر بننے کے لئے بمبئی آتی ہیں ان میں سے کئی لڑکے لڑکیاں تو ایسے ہوتے ہیں جو گھر سے کافی رقم چرا کر اپنے ساتھ لاتے ہیں جو فلمی دنیا کے جعلساز اور نقلی ڈائرکٹر، پروڈیوسر اور ایکسٹرا سپلائر ان سے بٹور کر کھا جاتے ہیں اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر یہاں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں کیا لڑکیاں کیا لڑکے۔ میرا تو خیال ہے تم اپنے اس خیال کو دل سے نکال دو!" اعجاز نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اگر قسمت میں ٹھوکریں ہی لکھی ہیں تو میں ٹھوکریں کھانے کو تیار ہوں۔ لیکن ایکٹر بننے کے خیال کو دل سے نہیں نکال سکتا۔" میں نے کہا

"اچھا تو یہ بتاؤ ابا میاں سے اجازت لے کر آئے ہو؟

اعجاز نے پوچھا

"نہیں۔ ایف اے کرنے کے بعد میں چپکے سے گھر سے بھاگ آیا ہوں۔" میں نے کہا

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر تمہارے ابا میاں کسی طرح تمہارا کھوج لگا کر تمہاری تلاش میں یہاں آنکلے تو مجھے کس قدر شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ میں تمہارا لنگوٹیا یار ہونے کی حیثیت سے اُن کو کیا جواب دوں ۔۔" اعجاز نے کہا۔

"بس تو پھر اگر تمہیں میرے ابا میاں کا ڈر ہے تو میں آج ہی کسی ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیتا ہوں۔ تمہارے پاس سے چلا جاتا ہوں ۔۔" میں نے کہا

"اچھا یہ بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ بہت مال ہے تمہارے پاس ۔۔" اعجاز نے کہا۔

"کوئی خاص مال تو نہیں۔ بہرحال دو ہزار روپیہ اباجان کی صندوقچی سے چوری نکال لایا ہوں۔" میں نے کہا

"چوری ۔۔!"

"بالکل ۔۔!"

"یہ کام بھی تم نے اچھا نہیں کیا چور کا دوست چور۔ اب تک

تو تمہارے ابا میاں مجھے بڑا شریف آدمی سمجھتے آئے ہیں لیکن اگر انہیں یہ پتہ چل گیا کہ تم میرے پاس ہو۔ بمبئی میں تو تمہارے سامنے تھانے میں میرا بیچ بھی کٹوائیں گے۔"

"اگر تمہیں یہ کھٹکا لگا ہوا ہے تو میاں میں نہیں رہتا تمہارے پاس، ان گول مول باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ تم منہ سے تو نہیں کہتے لیکن دل میں یہ چاہتے ہو۔ کہ میں تمہارے پاس نہ رہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ اپنے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی پیدا نہ کرو۔ یہ تمہاری اپنی جگہ ہے۔ جب تک تمہارا جی چاہے رہو۔ اور جب یہ دو ہزار روپیہ تمہاری جیب سے نکل کر کسی دوسرے کی جیب میں چلا جائے۔ تو میں اپنی حیثیت کے مطابق تمہاری مالی مدد بھی کروں گا۔ تم میرے یار قسمت آزمائی کرو فلم سٹار بننے کیلئے۔ شاید تمہیں ٹانکا لگ ہی جائے" اعجاز نے کہا۔

ہم مزے مزے چائے پیتے رہے باتوں سے باتیں نکلتی چلی گئیں اس وقت جنگ کا زمانہ تھا۔ دوسری عالم گیر جنگ پورے عروج پر تھی۔ نازی فوجیں قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہوئے آ۔

بڑھتی چلی جا رہی تھیں ہر محاذ پر فتح جرمن کی ہو رہی تھی لیکن ہندوستان اس جنگ سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ برطانیہ حالانکہ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ لیکن کانگریس کی تحریک آزادی بھی اس وقت پورے عروج پر تھی۔ اور ہندوستان میں فلم انڈسٹری بھی۔ خام مال فلمیں تیار کرنے کے لئے لائسنس پر ملتا تھا نئی کسی فلم کمپنی کو لائسنس نہیں ملتا تھا۔ پرانی فلم کمپنیوں کو لائسنس دیئے جاتے تھے۔ ایک لاکھ کا لائسنس بلیک میں تین لاکھ میں بک جاتا تھا۔ دو لاکھ روپیہ منافع ۔ بڑی بڑی فلم کمپنیوں کے مالک اس وقت بڑے مزے میں تھے۔ کاردار پروڈکشن، منروا موی ٹون۔ رنجیت موی ٹون۔ شری ساؤنڈ۔ پربھات۔ اندرا موی ٹون۔ جیت پروڈکشن۔ شالیمار پکچرز۔ فضلی فلمز، ایسے بڑے بڑے فلمی اداروں کو ایک کی بجائے بیک وقت کئی لائسنس مل رہے تھے سیٹھ لوگوں کی بس چاندی ہی چاندی تھی۔

اور فلم اسٹاروں کی بھی۔ جو فلم اسٹار پہلے دس ہزار لیتا تھا اس وقت بیس ہزار لینے لگا تھا۔ پچاس ہزار لینے والے فلم میں اداکاری کا ایک لاکھ لینے لگے تھے اور انکم ٹیکس فلم کمپنی کے ذمہ اور لگاتار فلمیں پچھلے سال سے دوگنا زیادہ تیار

ہونے لگی تھی۔

اور یا پھر جنگ کے دنوں میں بلڈنگوں، مکانوں، اور کھولیوں کے مالکوں کی پانچوں گھی میں تھیں۔ مکان کی اتنی قلت تھی۔ کہ کہیں کوئی مکان خالی نہیں ملتا تھا۔ اور نہ دکان —— کرائے پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئے تھے۔ کسی مکان یا دکان کا قبضہ لینے کے لئے پگڑی اتنی مانگی جاتی تھی کہ اچھے خاصوں کی پگڑی اتنی مانگی جاتی تھی۔ کہ اچھے اعجاز چونکہ اس بلڈنگ میں پرانا کرایہ دار تھا اس لئے دو کمروں کا ایک سو بیس روپے کرایہ ادا کرتا تھا۔ اگر اسے اس زمانے میں اسے کسی دوسری جگہ جائے رہائش تلاش کرنا پڑتی تو پہلے تو خاں جگہ تلاش کرنے سے بھی شاید نہ ملتی اور اگر مل بھی بن جاتی تو پگڑی اتنی زیادہ مانگی جاتی کہ اعجاز کے گلے کی چوڑیاں مل جائیں۔

چائے سے فارغ ہوتے ہی اعجاز نے مجھے سو جانے کا مشورہ دیا تو کیونکہ میں بڑا لمبا سفر طے کر کے آیا تھا۔ ایک ہزار میل کا فاصلہ۔ پورے اڑتالیس گھنٹے کا سفر —— اور میں سو گیا۔ اس وقت سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

اس کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو سمندری ہوائیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اور مغربی گھاٹ سے کالی گھٹائیں اڑتی چلی آرہی تھیں

کالی گھٹائیں !

مون سون !

میرے دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کالے کالے بادلوں میں چھپ گیا۔ سمندری ہوائیں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئیں۔ کالی گھٹاؤں سے سمندر برسنے لگے۔

بمبئی کی اکثر عمارتیں پتھر کی ہیں اور ان کی چھتیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں کیونکہ بمبئی میں بارش بڑی تیز ہوتی ہے اور لگاتار پندرہ پندرہ دن تک بھی ہوتی رہتی ہے۔ سورج دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بمبئی کی برساتوں کا حال ہے۔ پورے دو مہینے فلمی نگار خانوں میں شوٹنگ برساتوں کی وجہ سے بند رہتی ہے۔

بمبئی کی برساتیں اگر طوفانی ہیں تو رومانٹک بھی ہیں۔ فلمی نگار خانوں کے ساتھ بمبئی کے دوسرے صنعتی مراکز بند نہیں ہو جاتے، کاروبار بند نہیں ہو جاتے۔ ملیں اور کارخانے کام کرنا نہیں چھوڑ دیتے سوائے فلموں کی شوٹنگ کے سب چلتا ہے بارش میں گلیاں اور بازار پر رونق دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں کے لوگ اس موسم سے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں موسلا دھار بارش میں وہ اپنا کام کاج بھی کرتے ہیں اور سیر و تفریح بھی زور بارش رکنے کا نام نہیں لیتی۔

اس دن بھی بارش ایسی شروع ہوئی کہ رکنے میں نہ آرہی تھی ساری رات لگاتار ایک سی بارش ہوتی رہی۔ دوسرا دن آیا۔ بارش نہ رکی۔ کالی کالی گھٹاؤں سے چھاجوں پانی لگاتار برس رہا تھا اور میں گھبرا گیا۔ کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے آسمان پھٹ گیا ہے اور اس سے سمندر برسنے لگا ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اعجاز تو اپنے کام پر چلا گیا۔ میرا بھی بمبئی کی سیر کرنے کا خیال تھا۔ لیکن اتنی تیز بارش میں گھر سے باہر قدم دھرنے کی جرأت نہ پڑی۔ جدھر دیکھو دھائیں دھائیں پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ نیچے مین بازار کی سڑک پر جب سے بارش شروع ہوئی تھی، مسلسل ایک دریا سا بہہ رہا تھا۔ مگر ٹریفک بدستور جاری تھی فٹ پاتھوں پر لوگ اور سڑک پر گاڑیاں آجا رہی تھیں، موٹریں بسیں، سائیکل، ٹرام، وکٹوریہ، وغیرہ میں گھر میں بیٹھا بیٹھا بور ہو گیا تھا۔ بارش کے بند ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن بارش تو بند ہونے میں نہ آرہی تھی۔

دھواں دھار بارش!

وہ دن بھی گزر گیا۔ بارش نہ رکی — رات آگئی — ساری رات بارش ہوتی رہی — صبح ہوئی — بارش نہ رکی — سارا

دن پانی اسی رفتار سے برستا رہا ــــ میں نے سمجھا کہ بس بمبئی کی تباہی آگئی ہے سب بلڈنگیں ڈھے جائیں گی اور اب تک نہ جانے کتنے ہی مکان ڈھے چکے ہوں گے۔ کتنے ہی لوگ ہلاک ہو چکے ہوں گے اور نہ جانے اب تک اتنی تیز بارش میں کیا کچھ ہو چکا ہو گا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ بمبئی آباد تھی۔ اسی شان سے آباد تھی۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ بمبئی کے لئے۔ ایسی بارشیں تو اکثر ہوتی ہی رہتی تھیں برساتوں میں۔ ایک اور رات آئی۔ بارش نہ رکی۔ پھر صبح ہوئی۔ پانی بدستور برس رہا تھا۔ اب تو میں اتنا بور ہو گیا تھا۔ بادلوں اور بارش کو کوسنے لگا۔ میں نے دل ہی میں کہا۔" لعنت ہے ایسی بمبئی پر جہاں بارش ہی رکنے میں نہیں آرہی۔ یہاں سے کہیں اور بھاگ جانا چاہیئے۔ توبہ ایسی بوریت۔ اس دن بھی اعجاز ناشتے سے فارغ ہو کر برستے پانی میں اپنے کام پر جا چکا تھا۔

میں تھوڑی دیر کے لئے کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ برستے پانی میں بمبئی کی عمارتیں، چمنیاں، ٹاوریوں دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے جادو کے کسی جزیرے میں کسی جادوگر کا جادو گھر ہو۔

اتنی تیز بارش میں بھی سڑک پر ٹریفک جاری تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگ آجا رہے تھے۔ سامنے باہر والا کھڑا تھا۔ بارش کے شور میں میں

نے اسے گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازیں دیں۔ تو ایک آواز اس نے سن ہی لی
میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"اوپر آؤ —"

میں اس بوریت کو دور کرنے کے لئے اب شراب پینا چاہتا تھا جس کا میں عادی تھا۔ جو میری بہترین ہابی تھی۔ یہ کیسی ٹریجڈی تھی میرے ساتھ کہ تین دن سے میں نے پی نہ تھی۔ اعجاز تو نہ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب، اسے کوئی نشہ اچھا نہ لگتا تھا وہ تو بس گھاسلیٹ قسم کا آدمی تھا۔

"کیوں بابو جی کیا چاہیئے" باطھر والے نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

اس کے کپڑے کچھ کچھ بھیگے ہوئے سے تھے۔ اس کا نام عبدل تھا وہ میرٹھ کا رہنے والا تھا۔ بچپن ہی میں گھر سے بھاگ کر بمبئی آیا تھا۔ اور اب وہ جوان ہو گیا تھا۔ اور اپنا گھر بار اسے یاد ہی نہ رہا تھا۔ اسے یاد ہی نہ رہا تھا۔ یہ بمبئی کی دلکشی کا جادو تھا۔

"ایسے میں شراب کہیں سے مل سکے گی عبدل" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں بابو جی — کتنی چاہیئے —" عبدل نے پوچھا

"ایک بوتل لے آؤ۔" میں نے کہا

اور عبدل باہر والا تھوڑی دیر میں شراب کی ایک بوتل اور اس کے ساتھ کھانے کو کچھ نمکین چیزیں لے آیا۔ اس چائے خانے کا مالک خفیہ طور پر دیسی شراب بھی فروخت کرتا تھا۔ عبدل باھر والا تنخواہ کے علاوہ اس سے ناجائز شراب فروخت کرنے کی کمیشن بھی لیتا تھا۔

شراب ریاست جوناگڑھ کی سولفیہ تھی۔ جس کا ذائقہ اور خوشبو سونف کی تھی۔ اور پانی سے یا سوڈا ڈالنے سے دودھ کی طرح سفید ہو جاتی تھی۔ بڑی مزیدار اور تیز شراب تھی۔ میں نے اس وقت سوڈے کی بجائے پانی استعمال کیا۔ بوتل کی قیمت دس روپے تھی۔ بڑی سستی شراب، میرا خیال تھا کہ اگر پوری طرح گھٹ نہ ہوا تو ایک اور بوتل چلے گی۔ لیکن میں تو اس کا تیسرا پگ پیتے ہی چکری کھا گیا بڑا سرور ہو گیا۔ تو مجھے گھاٹن لڑکی سے خریدی ہوئی کستوری یاد آئی

میں نے دل میں کہا اُسے چیر کر دیکھنا چاہیئے اس میں کیا ھے؟

میں نے نافہ کوٹ کی جیب سے نکال کر سونگھا تو اس سے بدستور کستوری کی بڑی تیز خوشبو آرہی تھی۔ میں نے بلیڈ سے اسے چیر ڈالا، دیکھا تو اس میں مٹی تھی۔ جس میں کوئی خوشبو نہ تھی۔

"ہت تیری ایسی تیسی — تو مجھے چھل گئی۔ چھلیا —— چھوکری۔

اور ــــــــ اور ــــــــ"

اور میں نے شراب کے نشے میں کستوری بیچنے والی اس گھاٹن چھوکری کو بڑی گالیاں دیں۔ میں نے نلنی کو کھڑکی سے باہر برستے پانی میں پھینک دیا۔ ایک اور پگ لیا۔ تو مجھے کیوڑے کے پھول یاد آ گئے۔ جو سامنے کارنس پر ایک گلاس میں رکھے تھے۔ اور ابھی تک مرجھائے نہ تھے۔ اور نہ ان کی مہک کم ہوئی تھی۔

میں شراب کے نشے میں کیوڑے کے پھولوں کو سونگھنے لگا۔ چومنے لگا۔ اور مجھے کالج کے زمانے کی اپنی ایک محبوبہ کا لکھا ہوا ایک افسانہ یاد آ گیا۔ سلمٰی تھا اس کا نام! بڑے اچھے افسانے لکھتی تھی۔ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ اس وقت بھی میرے سوٹ کیس میں پڑا تھا۔ میں وہ کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔

پہلا افسانہ تھا ــــــــ نرگس کے پھول ــــــــ جو مجھے بے حد پسند تھا۔ میں افسانہ پڑھتے ہوئے ساتھ ساتھ شراب بھی پیتا رہا۔

اور ــــــــ نہ جانے کس وقت آؤٹ ہو کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

ہوش آنے پر مجھے اعجاز نے بتایا کہ میں بالکل اوٹ چارپائی کی

بجائے نیچے زمین پر چت پڑا تھا۔ سگریٹ کی بجائے میرے منہ میں پنسل تھی اور کتاب کی بجائے میں نے ہاتھ میں اپنا جوتا پکڑا ہوا تھا۔ اور تکیئے کی بجائے میرا سر شراب کی خالی بوتل پر تھا۔ اعجاز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک بلی میرے گال چاٹ رہی تھی۔

چھتریوں کا سمندر

موسلادھار بارش بند ہو گئی۔ لیکن ہلکی ہلکی پھوار ابھی پڑ رہی تھی۔ رِم جھم ! رِم جھم !!

میں کھڑکی میں کھڑا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا بازار کی سڑک پر چھتریوں کا سمندر بہہ رہا تھا، جتنے لوگ اتنی ہی چھتریاں۔ سڑک کے اس سرے سے اس سرے تک چھتریاں ہی چھتریاں دکھائی دے رہی تھیں۔

متواتر کئی روز سے ایک کمرے میں بند رہنے سے میں بالکل بور

ہو گیا تھا۔ دل میں آیا بازار میں چل کر ادھر ادھر ذرا گھومنا پھرنا چاہیئے بمبئی کی سیر کرنا چاہیئے۔ کمرے کے تالے کی ایک چابی اعجاز کے پاس تھی۔ دوسری اُس نے مجھے دے دی تھی۔ کہ جب میرا جی چاہے تالا لگا کر گھومنے پھرنے چلا جاؤں۔ میں کمرے کا تالا لگا کر نیچے بازار میں آ گیا۔ تھوڑی دیر فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا۔ بھیگی بھیگی ہوا بڑی خوشگوار تھی۔ جی میں آئی ٹہلتے ٹہلتے ذرا آگے چلنا چاہیئے اور میں نے روڈ مارچ شروع کر دی میں بھنڈی بازار سے کافی آگے نکل آیا۔

یہاں بھی ہر طرف چھتریوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا مرد اور عورتیں سب چھتریاں تانے چلے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے میں دادر پل کے نیچے پہنچ گیا۔ پل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مندر تھا۔ جہاں سادھو لوگ بیٹھے گانجا پی رہے تھے سرخ سرخ آنکھیں نکال کر کھانس رہے تھے۔ دوسری طرف ریلوے اسٹیشن کے آہنی جنگلے کے قریب آٹھ دس کتے شاید شوٹنگ کر رہے تھے۔ خارش کی ماری ایک کتیا شائد مصیبت کی ماری کوئی ہیروئن تھی جس کا ایک لڑکا کتا لڑائی شاٹ لے رہا تھا اور دوسرے کتے شاید کرین شاٹ لینے کی تیاری کر رہے تھے۔

اسٹیشن کے دوسری طرف کچرے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن میں ایک جگہ ایک مری ہوئی بلی کی لاش پانی سے پھولی ہوئی تھی اور دوسری طرف دادر پل کی سیڑھیاں تھیں جہاں بھکاری بیٹھے بھیک مانگ رہے تھے۔ ان سے تھوڑی دور ایک لڑکا لکڑی کے ایک تختے پر پکوڑے بیچ رہا تھا۔ اور آوازیں لگا رہا تھا، پکوڑوں پر اس نے موم جامہ پھیلایا ہوا تھا۔ جس سے پکوڑے پھوار سے بھیگ نہ رہے تھے۔

لڑکے سے ذرا آگے دو گجراتی آپس میں گرمی خشکی چھانٹ رہے تھے۔

"تم خالی پیلی بوم مارتے ہو ___" ایک گجراتی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"اوہ۔ تم لفڑا کرتا ہے۔ ہمارا ٹائم کھوٹی کیا۔ بمبئی میں کوئی کام بھوکٹ میں نہیں ہوتا۔" دوسرے گجراتی نے جواب دیا۔

لیکن ان کی باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں ایکا ایکی رم جھم بھی رک گئی تھی۔ اور میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پل کے آخری کونے تک آگیا تھا۔ جہاں ایک نوجوان چھابا نہ کھولے اس میں رنگا رنگ کے ریشمی رومال اور ریشمی رنگ برنگی ساڑھیاں

سجائے کھڑا تھا۔ وہ جب چھتری گھماتا تو دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے دھنک کے رنگ گھومنے لگتے۔

پھوار بند ہو جانے کے بعد لوگ ابھی تک چھتریاں تانے چل پھر رہے تھے۔

میں ذرا اور آگے نکلا تو سامنے ایک ناٹے قد کا نوجوان چھتری تھامے آہستہ آہستہ بڑے ٹھاٹھ سے پل کی سیڑھیاں چل رہا تھا۔ سر پر جاکی کیپ۔ گلے میں لال تعویذ گول گلے کی دھاری وال بنیان اور تنگ سی پتلون پہنے ہوئے جس کی مہریاں اس نے ٹخنوں سے اوپر چڑھا رکھی تھیں اسے دیکھ کر بھکاری اور سودا بیچنے والے لوگ سہم کر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ اور جب وہ پل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو ریشمی رومال اور باڈیاں بیچنے والے نے اسے جھک کر سلام کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے سلام کیا وہ نوجوان دادر پل کا دادا تھا۔ دادا بمبئی میں بدمعاش اور غنڈے کو کہتے ہیں۔ اس کا نام تھا۔

پیڈرو دادا ــــ!

وہ ایک لکڑی کے کھوکھے کے پاس آ کر رک گیا۔ جس پر فلمی گانوں کی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

پیڈرو دادا نے لکڑی کے کھوکھے کو ٹھوکر مار کر پاس ہی ڈھابے میں گوٹا پان لگائے بیٹھے ایک بوڑھے سے پوچھا

"یہ کچرا لوگ اِدھر کدھر سے آیا ہے؟"

گوٹا پان بیچنے والے نے کہا۔

"دادا یہ ــــ یہ ــــ نیا چھوکرا ہے۔ آج سے ادھر دھندا کرے گا۔ نیلی پگڑی والے نے اجازت دے دی ہے۔"

بمبئی میں نیلی پگڑی والا سپاہی کو بولتے ہیں دادا نے سپاہی کی ماں بہن کو بڑی غلیظ گالیاں سنائیں پھر بولا

"کدھر ہے یہ چھوکرا؟"

اور ایک پتلا دبلا لڑکا تھر تھر کانپتے ہوئے آگے سرک آیا لیکن گردن جھکائے خاموش رہا۔ پیڈرو دادا نے اسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور بولا۔

"اپن تو تم سے آٹھ آنہ روز کا دے گا۔ تو ادھر پل پہ بیٹھ سکتا ہے۔ نکالو آج کی اٹھنّی۔"

"آج کی اٹھنی تو نیلی پگڑی والے کیا ہے دادا"

یہ سنتے ہی پیڈرو دادا نے پھر نیلی پگڑی والے کی ماں بہن اپنی اور کھڑکی کا کھوکھا اٹھا کر بیچ میں پھینک دیا۔ تیز تیز ہوا

میں فلمی گیت پر کھول کر پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے ریلوے لائن پر جا گرے اتنے میں کلیان لوکل سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔ اور فلمی گیتوں کو کچلتے ہوئے پل کے نیچے سے گزر گئی۔ لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پیڈرو دادا نکل آیا۔ گوٹا پان بیچنے والا لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔

"دیکھو چھوکرا ــــ یہ اس پل کا دادا ہے موالی ہے سمجھو اس پل کا مالک ہے۔ اس کی اجازت بغیر ادھر آج تو باجو میں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ اس سے معافی مانگو۔ آٹھ آنے روج کا بھتہ دو۔"

میرے جی میں یہی آئی کہ دادا کو گردن سے پکڑ کر ایک ایسا ٹھوسکا چکھاؤں کہ اس کی بتیسی باہر نکل آئے۔ ایسے لوگ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ میں کسی کو کسی پر ظلم کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا میرا خون کھول جاتا ہے۔ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں مجھ پر پاگل پن سوار ہو جاتا ہے لیکن اس وقت نہ جانے میں نے کیسے اپنے غصے پر قابو پا لیا بمبئی میں آئے آج میرا چھٹا دن ہے۔ آتے ہی اپنے ساتھ اگر اعجاز کو بھی کسی مصیبت میں ڈال دیا میں نے تو بیچارہ بڑا پریشان ہوگا میں جلدی سے دادر پل کے اس پار اتر گیا

کنول کالے بال اور سارٹھیاں

پُل کے پار بھی چھتریوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کدھر چلنا چاہیئے۔ بمبئی ایسا اتنا بڑا گنجان آباد شہر میرے لئے بالکل نیا شہر تھا۔ بمبئی شہر تھا۔ میں نے اس کے گلی کوچوں، پارکوں، سڑکوں اور خوشنما علاقوں کے صرف نام سنے تھے۔ مثلاً بوری بندر گیٹ آف انڈیا۔ فورٹ ایریا۔ میرین ڈرائیو۔ ملبار ہل۔ جوہو جو پاٹی۔ وداں کیسیر، باندرا، پالی ہل، ماہم، ٹنگا پریل، بائی کلہ، دادر، فارس روڈ، یہ نام میں نے پہلے بھی کئی بار سنے ہوئے تھے۔ لیکن ان جگہوں کی سیر نہ کی تھی۔ پروگرام تو یہ تھا کہ میں کسی فلم کمپنی میں قسمت آزمائی

کرنے سے پہلے جی بھر کر بمبئی کی سیر کروں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ بھنڈی بازار میں انجانز کے ٹھکانے پر پہنچتے ہی مون سون کا ریلا آ گیا۔ کالی کالی گھٹائیں مغربی گھاٹ سے امڈ آئیں اور متواتر چھ دن موسلا دھار بارش ہوتی رہی تھی اور آج تھمی تھی۔ اور میرا جی کرتا تھا۔ خوب سیر کروں۔ میں دائیں طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ تو سامنے سے مجھے بہت سی لونڈیاں آتی دکھائی دیں۔

وہ سب سائیکلوں پر سوار تھیں —— رنگ برنگی ساڑھیں اوڑھے ہوئے —— کالے کالے چمکدار آبنوسی بال —— اور ان کے جوڑے میں کنول کے پھول لگائے ہوئے۔

کسی کالج میں چھٹی ہوئی تھی۔ یہ لونڈیاں وہیں سے پڑھ کر آ رہی تھیں —— ایک نہ دو پورا جلوس —— وہ سب سائیکلوں پر سوار تھیں اور بڑی تیز سائیکل چلا رہی تھیں۔

وہ دس دس کی ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھیں دس سائیکلیں آگے، دس سائیکلیں ان کے پیچھے۔ اور یہ جلوس ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ ان لڑکیوں میں سے گوری کم اور سانولی زیادہ تھیں۔ لیکن خوش جمال سب کے بڑے دلکش۔ جسم سب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ —— بڑے ہی پیارے —— اور

سائیکلوں کے ہینڈل کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشنما ٹوکریاں لگی تھیں جن میں انہوں نے کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں کافی دیر وہاں کھڑا گومتی کافی ان لونڈیوں کو دیکھتا رہا۔ یہیں فٹ پاتھ پر میری ملاقات ایک قلم کار سے ہوئی ــــ

وہ بھی ــــ! میری طرح فٹ پاتھ پر کھڑا کنول کالے بال اور ساڑھیاں دیکھ رہا تھا۔

ہم پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے بڑے بے تکلف ہو گئے۔

انجم تھا اس کا نام ــــ!

ایک فلمی کہانی کے مکالمے لکھنے کے لئے اسے دلّی سے بلایا گیا تھا۔ وہ بھی میری طرح اس شہر میں اجنبی تھا اس کی ایک کہانی ایک فلمی پرچے میں چھپی تھی۔ جو خاص کر فلمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ ایک فلم کار نے اس کی اچھوتی تخلیق سے متاثر ہو کر اسے یہاں بلا لیا تھا وہ ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے کافی دور نکل آئے اور پھر وہ ایک موڑ پر مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔ کیونکہ جس ہوٹل میں وہ مقیم تھا قریب آگیا تھا۔

اب بس اکسیلانٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ سڑک کے اس پار پٹڑی پر ساتھ ساتھ بنی کھوکھوں کی دکانوں میں ایک جگہ گراموفون بج رہا تھا۔ ریکارڈ کافی گھسا ہوا تھا آواز کسی قدر مبہم سی تھی۔ اس میں کٹاؤ اور گھاؤ پڑے ہوئے تھے بس بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔

پیا بن ناہیں آوت چین

ایک بڑا پرانا فلمی گیت —— اور سہگل کی آواز میں بس خلاء میں نظریں سموئے دور کہیں دیکھنے لگا۔

پیا بن ناہیں آوت چین

آواز کے گھاؤ —— معاً اس آواز کے ساتھ ہی میرے ذہن میں میرے ایک پرانے پیار کی کہانی ابھر آئی —— اس کی کہانی نے گوجرے میں جنم لیا تھا۔ گوجرے میں رہنے والی ایک لڑکی کے ساتھ مجھے پیار ہو گیا تھا۔ میرے خیالوں کے دھاگے اس وقت اس لڑکی سے جڑ گئے تھے۔ جس کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ جن میں پہلا بچہ یقیناً میرا تھا۔ لیکن وہ جس کے ساتھ اس شادی ہوئی تھی —— وہ چند کہیں کا اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا تھا۔

دور پچھم میں کالے کالے بادلوں کی ایک عظیم دیوار آسمان پر اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی آرہی تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ ہوا تیز ہوتی جارہی تھی۔

سڑک کے کنارے کھڑے پیڑوں کے پتے اکھڑ کنے لگے تھے جیسے کسی بند دروازے کی کنڈی کھڑکنے لگے۔

پتے پھر کھڑکے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بادلوں کی دیوار کے پیچھے بھاگ کر کوئی آیا ہوا ہے۔

کالے کالے بادلوں میں کنول پھول لگائے ...... اور کنڈی کی بجائے اس نے سائیکل کی گھنٹی کھڑکائی ہے اب میرے خیالوں کے دھلگے، کنول کے پھولوں، کالے بالوں اور ان سائیکلوں سے جڑ گئے تھے جو ابھی ابھی اس سڑک پر فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں

سامنے سے ایک بوڑھا پارسی ٹوکری میں انڈے لئے چلا آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک انڈا سی جوان چھوکری تھی جب وہ پارسی میرے پاس سے گزرا تو مجھے شرارت سوجھی میں نے اس سے پوچھا

"یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔"

اس پارسی کے غصہ کا پارہ شاید گھر ہی سے چڑھا ہوا تھا۔ اس نے تند لہجہ میں جواب دیا۔

"پوسٹل جیل کو —"

"اور یہ راستہ ؟"

"پاگل خانے کو۔"

"اور یہ — ؟"

"یہ جہنم کو —" پارسی کا لہجہ اور تند ہوتا جا رہا تھا

"شکریہ ! مجھے اسی راستے سے جانا ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ لیکن راستوں کی نشان دہی کرنے والا مجھے کو تیار نہ تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ سنکی اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ناک کے ساتھ اس کی بھنویں بھی اوپر چڑھ گئی تھیں — !

ویسے وہ پارسی تھا فلاسفر قسم کا انسان — کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے۔ کہ کسی چوراہے میں یا فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر راستوں کے روٹ بتائے۔ تم بتائے اپنا وقت ضائع کرے — اپنا مغز کھپائے

اس نے اپنے دل میں کہا۔ اگر اس شخص نے ایسا کیا ہے تو بالکل ٹھیک کہا ہے۔

یہاں ان گنت راستے ہیں — روشن راستے — تاریک راستے۔ موت کے راستے — میں سگریٹ سلگا کر کش لگاتے ہوئے، آگے چل دیا۔

چلتے چلتے میں ماھم پہنچ گیا۔۔۔ وہیں سے منڈنگا کی طرف نکل گیا۔ پیدل چلنے میں بڑا لطف آرہا تھا۔ مٹنگا میں کابنج بیک روڈ پر عیسائی بچوں کا ایک میلہ لگا ہوا تھا غبارے چاکلیٹ، مٹھائیاں، خوشبوئیں، لپ اسٹک نیل پالش، کاغذی پھول، اور ریشمی رومال بک رہے تھے بڑا دلچسپ ہنگامہ تھا۔ تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر میں نے طبیعت خوش کی اور چل نکلا اور بس چلتا گیا۔

اتنے میں باندرہ کا بس اسٹینڈ آگیا۔ میرے دل نے مشورہ دیا۔ اب ذرا بس کی سیر بھی کرنا چاہیئے۔ سامنے سے ڈبل ڈیکر آرہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ بمبئی میں عورتوں اور مردوں کی سیٹیں الگ نہیں ہوتی۔ گاڑیوں میں بلکہ آپس میں مل جل کر بیٹھتے ہیں۔ اگر ایک سیٹ پر ایک نہایت ہی خوبصورت لوگائی بیٹھی ہو اور ساتھ والی سیٹ خالی پڑی ہو تو اس پر کوئی بھی مرد آکر بیٹھ سکتا ہے۔

میں جس سیٹ پر بیٹھا تھا اس کے سامنے والی سیٹ خالی پڑی تھی بس چلنے سے پہلے ھی اس پر ایک لونڈیا آبیٹھی۔۔۔ بڑی اچھی سی۔۔۔ بالوں کے جوڑے میں کنول پھول۔۔۔ اور انگوری رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ہاتھوں کی انگلیوں میں ھیروں کی انگوٹھیاں۔ کالے کالے

آبنوسی بالوں میں لگا کنول کا پھول مہک دے رہا تھا چھوٹا سا یہ سفر بڑا پر لطف رہا۔ وہ بھی چپ رہی۔ میں بھی چپ رہا ـــــ لیکن ہماری آنکھیں آپس میں باتیں کرتی رہیں وہ مجھے رہ رہ کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے بھوکا نیگالی ریں گلے کو دیکھتا ہے۔

بس ماہم کے بس اسٹاپ پر آکر رک گئی تو پولیس کا ایک سپاہی اوپر کی منزل پر آکر غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب تو آپس میں بات کرنے کا موقعہ نکل آیا تھا میں نے اس لونڈیا سے پوچھا

"یہ کیا دیکھتا ہے۔؟"

"یہاں پر شراب کے لئے تلاشی ہوتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو میں نے بھی مسکراتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ "جیئو تم بھی ایک ایسی شراب ہو جسے میری آنکھیں پی رہی ہیں"

"کیا تم بمبئی میں پہلی بار آئے ہو ـــــ" اس لونڈیا نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ پہلی بار ـــــ" میں نے جواب دیا۔

"کئی لوگ اس شہر میں ناجائز شراب بیچنے کا دھندا کرتے ہیں ـــــ" اس لئے پولیس گاڑیوں کی تلاشی لیتی

رہتی ہے۔" لونڈیا نے کہا۔

اور پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ سپاہی مشتبہ لوگوں کی تلاشی لے کر چلا گیا۔ تو بس بھی چل دی، باکی کلہ بس اسٹاپ پر بس پھر رکی تو وہ لونڈیا بس سے اتری میں بھی اس کے ساتھ ہی اتر گیا۔

ہم دونوں باتوں کرتے ہوئے باکی کلہ برج کے اس پار اتر گئے۔ تو راستے میں اس لونڈیا کا اتفاق سے اولڈ مین یعنی باپ مل گیا۔ اور وہ لونڈیا جلدی سے آگے نکل کر اس کے ساتھ ہو گئی۔

ٹرام کا پٹہ پار کر کے وہ ایک نشیبی گلی میں گھس گئی تو میں بھی اس کے پیچھے اس گلی میں گھس گیا۔ کالے کالے بالوں میں لگے کنول کی مہک کا جادو مجھ پر چل گیا تھا آگے ایک موڑ مڑ کر وہ لونڈیا اپنے اولڈ مین کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ایک ایسی گاڑی کی طرح جس کی بریکیں اچانک خراب ہو جائیں اور وہ آپی آپ لڑھکتی چلی جائے جدھر جی چاہے۔ میں ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گھس گیا۔ وہاں سے تیسری میں۔

اب اندھیرا ہو گیا تھا۔ جب میں کھولی میں پہنچا تو

اعجاز کام پر سے واپس آچکا تھا۔ اور کھانے کے لئے میرا انتظار کر رہا تھا۔

اعجاز بھنڈی بازار کے صابری ہوٹل سے کھانا کھاتا تھا صبح کے وقت تو کام پر جاتے ہوئے ہوٹل سے کھانا اپنے ٹفن کیریر میں اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ لیکن شام کا کھانا بیرا اسے کھولی میں پہنچا دیتا تھا۔ اور جب سے میں آیا تھا اس نے ہوٹل کے بیرے کو بول دیا تھا کہ میرے لئے دوپہر کا کھانا بھی دے جایا کرے اور شام کے وقت دو آدمیوں کے لئے کھانا لایا کرے۔

" ارے یار یوسف کہاں تھے تم — میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں — کھانا تو ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔" مجھے دیکھتے ہی اعجاز بولا۔

" ابھی گرم کر لیتے ہیں کھانے کو —" میں نے گفت گو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" بارش میں کمرے کے اندر بیٹھا بیٹھا میں تو بالکل بور ہو گیا تھا۔ بارش رکی تو میں نے کہا۔ بمبئی کی سیر ہی کرنی چاہیئے"

" ٹھیک ہے۔ کہو پھر کہاں کہاں کی سیر کی —؟"

" مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کھا لینے دو پھر باتیں ہوں گی"

اعجاز نے جلدی جلدی سالن گرم کیا۔ بھنڈی بازار کے صابری ہوٹل نے اس دن بھنڈی توریاں پکائی تھیں بڑی لذیذ ــــ میں نے خوب مزے سے کھائیں ــــ لیکن میرے خیالوں کے دھلگے اب بھی کالے کالے بالوں کنول پھولوں اور ساڑھیوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس دن میں نے نیند میں بڑے ہی عجیب سپنے دیکھے

کالے کالے بالوں، کنول کے پھولوں اور ساڑھیوں کے!!

ملیں
اور
مزدور

بمبئی ایک بڑا شہر ہے۔ کاروباری شہر — جہاں کہ لاتعداد ملیں ہیں — کارخانے ہیں — ورکشاپ ہیں۔ اور — مزدور —

بمبئی ایسے دلکش شہر کی رنگینیاں اور رعنائیاں دیکھ کر میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ کسی فلم کا ہیرو بننے کی کوشش بعد میں کروں گا۔ پہلے ذرا جی بھر کر بمبئی کی سیر کر لوں۔

میں بمبئی کے تاج محل ہوٹل سے لے کر ان نیم تاریک چائے خانوں میں بیٹھا رہوں جن کی جھکی ہوئی چھتوں تلے ہر وقت دھواں منڈلایا کرتا ہے۔ اور بوسیدہ میزوں کے

گرد بیٹھے ہوئے انسان سایوں کی مانند دھندلے نظر آتے ہیں آسیب زدہ لوگ ـــــ یہ لوگ ان چائے خانوں کی طرح ذلیل ہوتے ہیں تمام دن ابلنے والی باسی زہریلی چائے پیتے ہیں۔ کئی کئی دن کے باسی سوکھے ہوئے ٹین کے پتوں جیسے ڈبل روٹی کے سلائیس کھاتے ہیں۔ گالیاں بکتے ہیں ـــــ گاہے رونے لگتے ہیں ـــــ گاہے گیت گاتے ہیں ـــــ کھوکھلے قہقہے لگاتے ہیں۔ زہریلی باسی چائے پر ـــــ اس دنیا پر ـــــ اپنی زندگی پر ـــــ جو چاکولیٹ یا کافی کے خالی کور کی طرح اندر سے بالکل خالی ہے۔ وہ شاید زندگی کو دھوکہ دے رہے ہیں یا زندگی ان کو دھوکہ دے رہی ہے۔

میں ایک دن بمبئی کے ایسے ہی ایک نیم تاریک غلیظ چائے خانے میں بیٹھا تھا سامنے پنواڑی کی دکان پر ریڈیو لگا تھا ـــ خبریں ہو رہی تھیں ـــ

"جاپانی طیاروں کی کلکتہ کے مغربی حصے پر بمباری"

خبریں سنانے والا ریڈیو میں کہہ رہا تھا

"کلکتہ میں آج دوبار ہوائی حملہ ہوا"

یہ خبر سن کر چائے خانے کا پٹھان مالک کھنکار کر بولا

"لو سن لو ـــــ لڑائی ہندوستان تک آن پانی ـــ"

اس کے جواب میں چائے کی پیالی ہونٹوں سے ہٹا کر ایک آدمی طنزیہ لہجہ میں بولا۔

"بس تمہاری موج ہے۔" چائے کا کپ چار آنے کا ہی کر دو۔" اور چائے خانے کی گھٹی ہوئی فضائیں ملے جلے قہقہوں کے شور سے گونج اٹھیں اتنے میں دو اور خبریں سنائی گئیں۔

"طبرق میں جنرل رومیل اور فیلڈ مارشل مونٹ گمری کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ"

"اس دوسری عالمگیر جنگ میں حکومت برطانیہ کا ہر روز دو کروڑ روپیہ خرچ ہو رہا ہے"

اتنے میں ایک لاری ادھر سے گزری جس میں لگے مائیکروفون پر ایک شخص اعلان کر رہا تھا۔

"کل رات کو آٹھ بجے دھوبی تالاب کمیونسٹ پارٹی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ جس میں کمیونسٹ لیڈر بھارتی ٹنڈن تقریر کریں گے۔"

اور چائے خانے میں باسی زہریلی چائے پینے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"اب جلسے کی ماں کی ..... یہ بتاؤ کل شام کو مٹی کا تیل ملے گا یا نہیں۔"

"آنا ستا ہو گا یا نہیں ——" دوسرے نے کہا۔

"مزدوروں سے بارہ گھنٹے کی بجائے آٹھ گھنٹے کام لیا جائے گا ہنیں ——" تیسرا بولا

"جلسے نہ کرو —— کھانڈ کی بلیک بند کرو ——" چوتھے نے کہا۔

بس چائے خانے سے نکل کر قریب ہی ایک پارک میں ٹہلنے لگا۔ جہاں میری ملاقات بمبئی کمیونسٹ پارٹی کی ایک سرگرم کارکن بملا دیوی سے ہوئی۔ جس کا کام یہ تھا کہ لوگوں کو کمیونسٹ بنانے کے لئے صبح سے شام تک بمبئی کے بازاروں، کاروباری اداروں اور سرکاری دفتروں میں بے خطر اپنی پارٹی کا لٹریچر بیچا کرتی تھی۔

میں نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اس کے تیکھے اور ترشے ہوئے نقوش مجھے یونانی مجسمے کی طرح معلوم ہوئے اس کی کنول سی آنکھوں میں زندگی مچل رہی تھی۔ اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی قدرتی ہوئی مہک نے مجھے بن پئے ہی بے خود بنا دیا۔

اس وقت اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ مجھے مونالزا کی مسکراہٹ معلوم ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پدمنی نے، دیول دیوی نے نیا جنم لیا ہے۔

ہم نے اس سے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر خریدا کافی دیر اس کے ساتھ دوسری عالم گیر جنگ اور کمیونزم پر باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھے باندرے میں پارٹی کے دفتر میں آنے کی دعوت دی اس کے چلے جانے کے بعد بھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے ہی پاس کھڑی ہوئی باتیں کر رہی ہے۔

کامریڈ بملا دیوی ـــ"

دوسرے دن میں اس کے دفتر میں ملا تو اس کے پاس اس کی سہیلی کامنی دیوی بیٹھی تھیں جو کہ بملا سے بھی کئی گنا حسین تھی۔

بملا نے میرا اس کے ساتھ تعارف کرایا۔ کامنی الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ سیٹھ ہٹپڑجی بھمبتی تھا۔

ایک بہت بڑا سرمایہ دار ـــ!

اور یہ ایک عجیب بات تھی۔ کہ ایک سرمایہ دار کی لڑکی نے ایک کمیونسٹ لڑکی کو اپنی سہیلی بنایا ہوا تھا۔ دونوں میں بڑی گہری چھنتی تھی۔

کافی دیر چپ چاپ بیٹھا سرمایہ داری اور کمیونزم کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ـــ میری سمجھ یہ پار نہ آیا

اور جو چیز میری سمجھ میں نہ آئے ہیں اسے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔

سرمایہ داری اور کمیونزم کو چھوڑ کر میں کامنی کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر فلم انڈسٹری کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو کامنی نے مجھے آنند بھون آنے کی دعوت دی۔

آنند بھون سیٹھ باپٹ جی کے بنگلے کا نام تھا۔ جو کہ باندرے میں تھا۔ کامنی کی زبانی معلوم ہوا کہ سیٹھ جی ان دنوں کاشی گئے تھے۔

دوسرے دن میں نے صبح ہی سے آنند بھون چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کامنی نے مجھے شام کو آنے کا وقت دیا تھا۔ مگر یہاں ایک ایک پل ایک ایک صدی ہو کر گزر رہا تھا۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی اور جب میں باندرے پہنچا تو کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے لائٹ فیوز ہو رہی تھی۔ بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں اس سنسان سڑک پر چلنے لگا۔ جو ہل لائن کو جاتی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی میں کامنی کی بتائی ہوئی نشانی پر اس کے بنگلے پر پہنچ گیا ــــ

کامنی نے کہا تھا۔

"سڑک ڈھلوان ہوتے ہی بنگلے شروع ہو جاتے ہیں چوتھا بنگلہ آنند بھون ہے۔"

میں ڈھلوان سڑک پر چلنے لگا۔ سامنے اندھیرے میں ایکا ایکی دھندلی سی روشنی جھلملانے لگی۔ یہ روشنی اتنی مدھم اور پراسرار تھی کہ کسی بھوت پریت کی آنکھ معلوم ہوتی تھی۔ یہ روشنی آنند بھون کے پھاٹک کی بتی سے پھوٹ رہی تھی۔

پھاٹک کھلا تھا۔

اندر کمرے میں آہستہ آہستہ پیانو بج رہا تھا۔ اور اس طوفانی رات میں پیانو کے سروں کو جھنکار بڑی ہی دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ یہاں درختوں کا سایہ تھا لیکن ہوا کے تیز جھونکوں سے مینہ کی بوچھاڑ برابر آ رہی تھی۔

میں تھوڑی دیر درختوں کے نیچے کھڑا مینہ کی بوچھاڑ میں بھیگتا رہا۔ اندر پیانو مدھم سروں میں بجتا رہا، دھندلی روشنی کھڑکی کے شیشوں میں لرزتی رہی

پھر بارش میں بھیگا ہوا ایک کتا کانوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے میرے پاس سے گزرا اور مجھے دیکھتے ہی بھونکنے لگا

میں بدحواس ہو کر دیوار سے چمٹ گیا۔

کتے کے بھونکنے کی آواز بارش کے شور میں برابر گونجتی رہی۔ اور ایکبارگی کمرے کا دروازہ کھول کر کسی نے جھانک کر کہا۔

" کون ہے۔ "

یہ کامنی کی آواز تھی۔ جسے پہچاننے میں میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا

" کون ہے۔ "

لمحہ توقف کے بعد کامنی نے پھر پوچھا

" اندھیرے میں کون کھڑا ہے۔ بولتے کیوں نہیں "

" میں ہوں روپ کمار " میں نے جواب دیا

" اوہ آپ ہیں مسٹر روپ کمار " جلدی سے کمرے میں آجائیے — " کامنی نے کہا۔

میں نے اپنا فلمی نام روپ کمار رکھا تھا۔ اور اسی نام سے اپنا تعارف کراتا تھا۔

" میں تو شام سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ " کامنی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" میرا خیال تھا۔ اتنی بارش میں آپ نہیں آئیں گے " کامنی نے کہا۔

"یہ تو بارش ہے۔ آسمان سے بم گر رہے ہوتے تو میں ضرور آتا۔ وعدے کا بڑا پکا ہوں ۔۔۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اتنے میں میری نظر کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئی جہاں کوٹھی کا کوئی ملازم دہلیز پر سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔ کمرے میں دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر کھڑکی کے پاس پیانو رکھا ہوا تھا۔ جس پر سفید رنگ کی کافی بڑی موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے برابر میں کامنی ایک بڑی نفیس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

دھندلی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ کچھ اداس سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا بھیگا ہوا کوٹ اتار کر کامنی کے کہنے پر اسے کھونٹی سے لٹکا دیا۔ اور ایک کرسی کھسکا کر اس پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"رمیش کافی لاؤ ۔۔۔" کامنی نے دہلیز پر کھڑے نوکر سے کہا۔

"ابھی لایا ۔۔۔" نوکر نے کہا۔ اور چلا گیا۔

"دروازہ بند کر دینا چاہیئے۔ بڑی تیز ہوا آ رہی ہے" کامنی نے کہا۔

"جی ہاں ۔۔۔ ہوا بڑی تیز ہے۔ اور بادلی ہو رہی ہے

میں نے کہا۔

کامنی نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

باہر بپھری ہوئی ہوائیں شور مچاتی رہیں۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

اتنے میں ملازم کافی لے آیا تو کامنی نے پوچھا ”بتایئے آپ کیا کچھ کھائیں گے۔“ نوکر جلدی سے کھانا تیار کر دے گا۔“

”میں اس وقت کچھ نہیں کھاؤں گا۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ——“ میں نے جواب دیا

”آپ تکلف کر رہے ہیں ——“ کامنی نے کہا

”تکلف تو آج تک میں نے کبھی کیا ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت تو بس کافی چلے گا۔“

ملازم چلا گیا۔ نیم روشن کمرے میں کافی کی ہلکی ہلکی بھاپ سے نکلنے والی تیز مہک ہر طرف بکھر رہی تھی ہم مزے مزے کافی پینے لگے۔ بڑی خاموشی ——

میں بھی چپ تھا۔

کامنی بھی چپ تھی!

مدھم روشنی میں اس کا دھندلا سایہ فرش پر کپکپا

رہا تھا۔ باہر درختوں میں ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں بارش البتہ تھم گئی تھی۔ بکھرے ہوئے بادل تیزی سے اڑتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے کامنی سے کہا۔

"آپ تو بہت اچھا پیانو بجاتی ہیں۔ پیانو پر کوئی فلمی گیت سنائیے۔"

اور کامنی پیانو بجانے لگی۔

پیانو کے نغمے سننے والے کو پاگل کر دیتے ہیں اور میں بھی اس وقت پاگل ہو گیا۔ مجھے پیانو کی آواز کے آسیب نے دبوچ لیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر کامنی کو سینے سے لگا لیا۔ اور بے تحاشہ اس کے ہونٹ، اس کے گال۔ اس کے بال چومنے لگا۔

کامنی کے کالے کالے لانبے بال جن میں کنول کے بجائے میں نے اپنا دل ٹانگ دیا تھا۔ ریشمی پردوں میں ہوائیں گنگنا رہی تھیں کمرے میں الف لیلائی شبستانوں کی طرح مرمری، خوابوں کا سنہرا دھندلکا چھا گیا تھا۔

صبح جب میں آنند بھون سے باہر نکلا بادلوں کو تیز تیز ہوائیں اڑا کر لے گئی تھیں۔ بسنتی دھوپ ہر طرف بکھر رہی تھی۔

میں جب نیو مارکیٹ کے پاس سے گزرا تو سڑک کی نکڑ پر راہ گیروں کا ہجوم ہو رہا تھا۔ اور ان کے درمیان اخبار بیچنے والا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ جس کا لباس بے ترتیب اور چہرے پر روکھا پن تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہا تھا۔

- مزدوروں کی فتح جنتا کی فتح ہے ساری دنیا کے محنت کشوں کی فتح ہے۔
- بمبئی کی پانچ ملوں میں ہڑتال
- سرمایہ داروں کی حفاظت کے لئے ملوں کے پھاٹک پر مسلح پولیس کا پہرہ۔
- مزدور اپنی مانگیں منوا کر رہیں گے
- مزدوروں کی آواز کو بندوقوں اور لاٹھی سے نہیں کچلا جا سکتا۔
- پنڈت نہرو ڈالر کے دیس میں۔
- کمیونسٹ پارٹی کا اخبار مزدور پڑھیے
- مزدور اخبار جنتا کا اخبار ہے۔
- مزدور اخبار ہندوستان کے محنت کشوں کا اخبار ہے جو عوام کی لڑائیوں کے حق کے لئے لڑتا ہے۔

و جو بھوک اور افلاس کے خلاف
آواز اٹھاتا ہے۔
و آج کا تازہ اخبار
و بمبئی کاٹن مل کے مزدوروں پر
پولیس کی فائرنگ
و مزدور یونین کا صدر کانتی پربھا
ہلاک پندرہ مزدور زخمی۔
و شہر کے کئی علاقوں میں ہڑتال

اخبار بیچنے والا شور مچاتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور چل کر میں نے راہ گیروں سے سنا کہ بمبئی ٹیکسٹائل مل کے ہڑتالی مزدوروں پر رات پولیس نے فائرنگ کی ہے ہڑتالی مزدور مل کو آگ لگانے کے لئے گڑبڑ کر رہے تھے۔

مزدور اونچے اونچے نعرے لگا رہے تھے۔ اور کانتی پربھا کر کی ارتھی کا جلوس سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ جلوس کے ساتھ ساتھ مسلح پولیس کی لاریاں بھی چل رہی تھیں اور مزدوروں کی زبان پہ صرف ایک ہی نعرہ تھا
کامریڈ کانتی پربھاکر کا خون سب کا خون ہے۔
انقلاب زندہ باد — انقلاب زندہ باد

کامریڈ کانتی پربھاکر امر ہے۔

کامریڈ کانتی سچ مچ مر گیا تھا۔ اس کی ارتھی توپ پر نہیں انقلاب زندہ باد کے نعروں پر جا رہی تھی اس کی ارتھی کے ساتھ، فوجی دستے نہیں مزدور تھے جن کے نعروں سے دھرتی دھڑک رہی تھی۔

ہرے ناریل
چیکو
چٹپٹے چنے

دوسرے دن بھی میں دوپہر کے وقت کامنی سے ملنے آنند بھون گیا۔ تو کامنی وہاں نہ تھی۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے پتا سیٹھ جی کاشی سے آ گئے ہیں کامنی ان کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہے۔ میں واپس لوٹا۔ سامنے سے ٹرام آ رہی تھی۔ میں اس پر سوار ہو کر فورٹ ایریا میں پہنچ گیا۔

یہ بمبئی کا ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں کئی یادگار چیزیں ہیں۔ ایک تو کالے گھوڑے کا بت ہے۔ اس لئے علاقے کو کالا گھوڑا بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک فوارہ بھی ہے۔ ذرا

اور آگے نکلو۔ تو لارڈ نکلسن کا بت ہے۔ جو کہ کالے گھوڑے کی طرح کالے پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کے سامنے گیٹ آف انڈیا۔۔۔

چٹپٹے چنے غریبوں ہی کا کھاجا نہیں لاکھوں پتی بڑے بڑے، سیٹھ، راجے، مہاراجے شوقیہ چٹپٹے چنے کھاتے ہیں۔ ساتھ ان کی رانیاں، مہارانیاں اور بیگمیں بھی ہوتی ہیں۔ جو چنے کم کھاتی ہیں اور چٹخارے زیادہ لیتی ہیں اور وہ بھی لپ اسٹک سے لال کئے ہوئے ہونٹوں کو یوں سکیڑ کر جیسے چنوں کی چمی لے رہی ہوں۔

جبھی ایک پنجابی چھوکرے کو مغالطہ ہوا نیا نیا پنجاب سے گیا تھا۔ سیر کرتا کراتا گیٹ آف انڈیا جا پہنچا وہاں ایک سیٹھانی بیٹھی چٹپٹے چنے کھا رہی تھی۔ اور چٹخارے مار رہی تھی۔ پنجابی چھوکرے نے سمجھا مجھ پر عاشق ہو گئی۔ اور کہہ رہی ہے۔ ایک چمی تو دے پیارے اور پنجابی چھوکرا اس معاملے میں بڑا جی دار تھا۔ دوسروں کی آنکھ بچا کر جھٹ سے سیٹھانی کی چمی لے لی۔ تو سیٹھانی نے اس کی، اپنی اونچی ایڑی والی لفٹی سے خبر لی۔ تو چٹپٹے چنے کھانے سے کئی بیوقوف جوتے بھی کھاتے ہیں۔

اور چیکو کا لفظ بمبئی میں طرح دار لونڈیوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

"ارے سالے وہ تو چیکو سی لونڈیا ہے۔"

"اری میری پیاری پیاری چیکو"

"جانِ من چیکو چلو چوپاٹی چلیں"

بارش شروع ہو گئی تھی۔ سب لوگ بھاگ کر گیٹ آف انڈیا کی عمارت میں پناہ لینے لگے۔ میں بھی ایک کونے میں جا گھسا۔

اتنے میں ادھیڑ عمر کا ایک آدمی مارواڑی لباس میں یوں بیڑی پیتے ہوئے میرے قریب آگیا۔ جیسے بیڑی نہیں ماں کا دودھ پی رہا ہے۔

یہاں لوگوں کی اتنی بھیڑ ہو گئی تھی۔ کہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ عورتیں بھی اور مرد بھی۔ وہ مارواڑی سرکتا سرکتا مجھ سے یوں آن لگا جیسے گوشت سے جونک آن لگتی ہے۔ پہلے تو میں نے کچھ محسوس نہ کیا لیکن جب وہ اکھڑا اکھڑا سائیکل سی چلانے لگا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے۔ پیچھے بھی لوگ کھڑے ہیں ادھر دیکھو نا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور مسکرا کر بچّی کی طرف گھومتے ہوئے مجھے دیکھا وہ چٹپٹے چنے کھا رہا تھا میں ذرا اور پیچھے کھسک گیا۔ تو وہ پنچے سے اور آگے سرک گیا۔ میں ذرا اور پیچھے ہٹ آیا۔ بس اب پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہ رہی۔

پیچھے دیوار تھی۔ لیکن وہ دیوث کا بچّہ تو بالکل ہٹ کے بدھن ثابت ہوا تھا۔ منہ ادھر پیٹھ ادھر، بالکل میرے ساتھ لگ گیا۔ اپنے آپ کو میرے اوپر یوں پھینک دیا۔ جیسے تاش کے پتے پر پتہ پھینکتے ہیں مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے دل میں کہا۔

کتنا بے ہودہ شخص ہے۔ میں نے ہاتھ سے اسے آگے دھکیلنے کی کوشش کی تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے نکال کر مجھے یوں پکڑ لیا جیسے سائیکل کا ہینڈل پکڑتے ہیں۔

"او۔ پوسلی۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں ؟" میں نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ پھر بھی خاموش ہی رہا۔ اور جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ بارش بند ہو گئی تھی لوگ

پھر گیٹ آف انڈیا کی عمارت سے باہر نکلنے لگے میرے دائیں طرف ایک عورت اپنی لڑکی کو گود میں لئے کھڑی تھی وہ ایک طرف سے ہٹ گئی۔ تو آتی جگہ نکل آئی کہ میں چپکے سے اس طرف نکل گیا۔ اور تھوڑی دور جا کر پیچھے گھوم کر دیکھا تو وہ شخص جہاں تھا بدستور وہیں کھڑا تھا۔ کیکڑا بنا ہوا تھا۔ اسے میرا سرک جانے کا بھی احساس نہ ہوا تھا۔ اپنے آپ کو دیوار سے رگڑ رہا تھا۔ منہ ادھر پیٹھ ادھر

انسان نہیں ریگ مال۔ میں نے اپنے دل میں کہا اسے ضرور کھجلی کی بیماری ہے۔ کھجلی کی بیماری —— جو بمبئی میں بڑی عام ہے۔ اور اس کھجلی کی کئی قسمیں ہیں۔ میں سوچنے لگا۔ اسے کونسی کھجلی ہے اتنے میں کسی نے مجھے جانی پہچانی آواز سے پکارا دیکھا تو مجھے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو تھا۔ میں لپک کر ادھر ہوا ہم دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

"ارے یار تم کہاں —— ؟" منٹو نے پوچھا

"ہیرو بننے آیا ہوں ——" میں نے جواب دیا

"پھر کسی پروڈیوسر کسی ڈائرکٹر سے ملنا تھا" منٹو نے مشورہ دیا۔

"اب تک دو چار سے مل چکا ہوں ۔ سالے توجہ ہی نہیں دیتے ۔" میں نے کہا۔

"بڑے چھند ہیں ۔ تم سے ہیرو تو بمبئی میں ایک بھی نہیں ۔" منٹو نے کہا۔

"بس تو کرو نا کسی پروڈیوسر یا ڈائرکٹر سے میری سفارش ۔" میں نے کہا۔

"ارے یار مجھے تو ابھی یہاں خود سفارش کی ضرورت ہے ۔ جب سے آیا ہوں بیکار بیٹھا ہوں ۔ سالے سیٹھ لوگ کام نہیں دیتے ۔" منٹو نے گلہ کیا۔

"بڑے چھند ہیں ۔ تم سا رائیٹر تو فلم انڈسٹری میں ایک بھی نہ ہوگا ۔" میں نے کہا

"یہاں رائٹری وائٹری نہیں دیکھتے ۔ مارکیٹ ویلیو دیکھتے ہیں ۔ کوشش کر رہا ہوں ۔ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا کوئی چانس ۔" منٹو نے کہا

"چانس تمہیں ملنا ہی چاہیئے منٹو ۔ تم بہت اچھا لکھتے ہو ۔ ایک بہت اچھے فن کار ہو ۔" میں نے کہا۔

"اور تم بھی ۔" منٹو نے اپنی خوبصورت سی عینک کے ہلکے نیلے رنگ کے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے کہا "کوشش جاری رکھوں گا ۔ نگار خانوں میں آیا جایا کرو

"اب تو میں ایسے نہیں جاؤں گا ــــ" میں نے کہا۔

"اور کیسے ــــ ؟" منٹو نے پوچھا

"کوئی اپروچ پیدا کر کے جاؤں گا ــــ" میں نے کہا

"بس تو پھر پالی ہل کی سیر کیا کرو۔ جہاں فلمی پریاں رہتی ہیں۔ اور یار تم پرستان کے شہزادے ہو چانس ہوتا کوئی فلمی پری بڑے بڑے پروڈیوسروں تک لے جائیگی تمہیں۔ منٹو نے کہا اور ہنسنے لگا۔

مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اتنے میں وہی مارواڑی شخص مجھے پھر دکھائی دیا۔ تو میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منٹو سے کہا۔

"اس شخص کو معلوم ہوتا ہے۔ کھجلی کی بیماری ہے"

منٹو نے اپنی خوبصورت عینک کے ہلکے نیلے رنگ کے شیشوں میں سے اسے دیکھا اور خاص امرتسری لہجے میں بولا۔

"ایہدی ماں ــــ ایہہ تے بڑا مشہور ــ"

اور اس نے اپنا منہ میرے کان سے لگا دیا۔ ہم دونوں ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگے۔

"سناؤ ــــ وہ پینے پلانے کا شغل ابھی کرتے ہو یا چھوڑ دیا۔" منٹو نے پوچھا۔

"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی ۔" میں نے کسی مشہور شاعر کا یہ مصرعہ سنا دیا۔

"چلو تو آج تمہاری دعوت میں کر دوں گا۔ لیکن کرسٹی میں ہوں شراب نہیں تاڑی پلاؤں گا۔" منٹو نے کہا۔

"اسے نہیں یار — تاڑی کیوں — مال ہے اپنے پاس ولائتی پئیں گے۔ اور تم یہ سمجھو تم ہی یہ دعوت دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ لیکن پئیں گے تاڑی۔ کبھی کبھی پی جائے تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ شراب پینے سے منہ کا جو ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ اس سے سنور جاتا ہے" منٹو نے کہا۔

"نام سنا ہے۔ ابھی تک چکھ کر نہیں دیکھی۔ یہ تاڑی ہوتی کیا ہے؟" میں نے پوچھا

"ناریل کی قسم کے ایک پیڑ کا رس نکال کر اس سے نشہ آور ایک مشروب تیار کرتے ہیں تاڑی تازی پی جائے تو ٹھیک ہے۔ باسی سے بدبو کرنے لگتی ہے اور میں پھر کہوں گا۔ تازی ہو یا باسی ہے۔ بڑے

مزے کی چیز ہے۔" منٹو نے کہا۔

"چلو تو آج تمہارے ساتھ وہی پیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

اور منٹو مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک طرف چل دیا۔

تاڑی

جیسے پیرس کے کسی کیفے میں لوگ سڑک کنارے بیٹھ کر شیمپئین پیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بمبئی کی پیرو شیئن ڈیری میں لوگ اس وقت تاڑی پیتے تھے "تاڑی پینے کا بمبئی میں یہ اس وقت ایک بہترین اڈہ تھا۔ ویسے گھٹیا قسم کے سارے شہر میں کئی اڈے تھے۔

منٹو کے ساتھ وہاں میں نے تاڑی پی ہم دونوں گھٹ ہو گئے۔ جھومتے جھامتے نکلے ایک پنواڑی کی دوکان سے مگھئی پان لئے۔ بمبئی میں ایک سو ایک قسم کا زردہ تمباکو اور ایک سو ایک قسم کا پان ملتا ہے۔

یعنی تلسی کے پتے اتنے پان سے لے کر ہاتھی کے پان اتنا کان۔

ہم جھومتے جھامتے چلے جا رہے تھے۔ کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔

"بابو جی ـــــ ڈیڑھ روپیہ دلوا دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔"

یہ نسوانی آواز تھی۔ میں نے سوال کرنے والی کی طرف دیکھا۔ بیس بائیس سال کی سانولی سلونی چھوکری جس کا بدن میلی اور پھٹی ہوئی چولی سے جھانک رہا تھا۔ اس کے باریک باریک ہونٹوں پر لپ اسٹک کی بجائے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اور اس کے پیر ننگے تھے۔ دھول میں اَٹے ہوئے۔

"بھکارن ـــــ" میں نے دبی آواز میں منٹو سے کہا۔

"آوارہ بھکارن ـــــ" تمہارے کسی نئے افسانے کا عنوان۔

"ڈیڑھ روپیہ چاہیئے ـــــ" منٹو نے اسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڑھ روپیہ کیوں — پورے دو کیوں نہیں —"؟

مجھے اس بھکارن پر بڑا ترس آیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو منٹو نے روک دیا۔ کہنے لگا۔

"ایکٹنگ کر رہی ہے۔ آوارہ — گندی ۔ زہریلی ناگن جنسی بیماریاں پھیلانے والی۔

اور پھر منٹو نے اپنی خوبصورت عینک کے ہلکے نیلے رنگ کے شیشوں میں اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے اسے دھتکار دیا۔

"جا جا — اپنا راستہ لے۔ یہ ڈھونگ کسی اور کو جا دکھانا۔ میں دس برس سے بمبئی میں رہتا ہوں ایسے ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں۔ بہت دیکھے ہیں میں نے"

لڑکی نے ایک پل کے لئے بڑی بڑی آنکھیں گھما کر میری طرف دیکھا اس کے موٹے موٹے پپڑیوں جمے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے۔ لیکن کچھ کہے بغیر بند ہو گئے۔ وہ بھی قریب ہی روشنی کے کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اور منٹو ان لڑکیوں کی ٹولی کو دیکھنے گئے۔ جن کے گورے گورے گلابی گلابی جسم بالکل ایسے لگتے ہیں جیسے شیشے

کے شوکیس میں رکھی صابن کی ٹکیاں۔ شاخوں سے ٹکتے ہوئے سیب، سنگترے، ناشپاتیاں اور انار کی کلیاں۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس لڑکی کے پاس آیا۔ تیل سے چپڑے ہوئے بال۔۔۔ گلے میں بندھا سرخ رومال، اس کے کان پر رکھی ہوئی ادھ جلی بیڑی اور اس کے چلنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کیا ہے۔۔۔؟

وہ چپکے چپکے سے اس لڑکی کو کچھ سمجھانے لگا۔ جو ہم نہیں سن سکتے تھے۔ اور پھر اس نے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تو وہ فوراً ہٹ کر دور کھڑی ہو گئی۔ جہاں اس آدمی کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے۔ اور وہ آدمی اب غصے میں آ کر چلا کر بول پڑا۔

"بڑے نخرے کرتی ہے۔ بچ کے جائے گی کہاں" اور اس نے دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں۔

اب وہ بھکارن بوکھلائی ہوئی سی اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ کبھی اس کے آگے ہاتھ پھیلاتی تھی۔ کبھی اس کے آگے۔ ایک بوڑھے آدمی نے جو ابھی ابھی ایک

موٹر سے اترا تھا۔ بھکارن کو اکنی دی۔ اور وہ گڑگڑاتی رہی۔

"مجھے ڈیڑھ روپیہ چاہیئے سیٹھ جی۔ بس ڈیڑھ روپیہ" بھگوان آپ کو لاکھوں کروڑوں دے سیٹھ جی۔"

مگر سیٹھ جی اپنی توند سنبھالے سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ جہاں دور کالے اندھیرے میں ٹھہرے ہوئے گہرے پانیوں میں جو پاٹی کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

پھر بھکارن نے ایک عورت کے سامنے ہاتھ پھیلایا جو ریشمی ساڑھی پہنے گلے میں موتیوں کی مالا ڈالے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی سلیکس پہنے ہوئے تھی دوسری گھٹنوں تک اونچا فراک ان کے اونچی ایڑی کے سینڈل فٹ پاتھ کے پتھروں پر کھٹاک کھٹاک بج رہے تھے۔

بھکارن دور تک ان کے پیچھے ڈیڑھ روپیہ مانگتی چلی گئی۔ لیکن ان تینوں نے ایک بار بھی اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھا اور نہ اس کی بات کا کوئی جواب دیا۔

اب بھکارن ایک جوان جوڑے کے سامنے اپنا رونا

رو رہی تھی۔ نکڑ کی دوکان سے لڑکے نے ایک بڑھیا سگریٹ کا ڈبہ خریدا تھا۔ اوساب سمندر کے کنارے کھڑا ہو کر پہلا سگریٹ سلگا رہا تھا۔

منٹو اس وقت دور کالے اندھیرے گہرے پانیوں میں چوپاٹی کی جھلملاتی روشنیوں کو اپنی خوبصورت عینک کے ہلکے نیلے رنگ کے شیشوں میں سے دیکھ رہا تھا۔ اور بھکارن دلال کے ساتھ جا رہی تھی۔ میں نے منٹو کے کندھے پر ہاتھ کا ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو منٹو میاں۔ اب وہ اس دلال کے ساتھ چلی جا رہی ہے۔"

"ہونہہ۔" منٹو نے چونک کر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "چھنال کہیں کی۔ چلو اس کا پیچھا کرتے ہیں اتفاق سے ایک اچھا افسانہ آپ ہی آپ مل گیا ہے۔ اور تم جانو مجھے تو ہر وقت بس افسانوں ہی کی تلاش رہتی ہے۔

اور ہم دونوں چپکے سے بھکارن اور دلال کے پیچھے ہو لیے۔ بڑے پوسٹ آفس کے پیچھے دلال سے ایک اندھیری گلی کے ہوٹل میں لے گیا۔ اور ہم دونوں سامنے فٹ پاتھ

پرو پیٹر کی آڑ میں انتظار کرنے لگے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد وہ نکلی دلال نے اسے ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ لے پانچ روپے اب کوئی پھکر نہیں جب جرورت پڑے سیدھی میرے پاس آجایا کر۔"

بھکارن نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور پوری بندر اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اس نے وڈالا کا ٹکٹ خریدا۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ۔ میں نے اور منٹو نے بھی وڈالا کا ٹکٹ خرید لیا۔ افسانے تو منٹو کی جان تھے۔ اس کی ساری عمر شراب پی کر افسانوں کا تعاقب کرتے گزر گئی۔ اس افسانے کو مکمل کرنے کے لئے منٹو اس کے گھر تک جانا چاہتا تھا۔ وڈالا کے اسٹیشن سے نکل کر وہ ریل کی پٹریوں کے پار ایک جھونپڑے کے پاس رکی دھیرے سے کسی کو پکارا۔

"ارے چیکو — ارے چیکو۔"

"کیا ہے ماندری۔" اندر سے ایک نیند بھری آواز سنائی دی اور اندھیرے میں ایک دھندلا سا سایہ جھونپڑی کے دروازے میں ابھر آیا۔

"تین نوٹانک دے دو۔" بھکارن نے کہا۔

"دو روپے ہیں۔" چیکو بولا

"پہلے تو ڈیڑھ میں ملتی تھی۔" بھکارن نے کہا۔

"آج مہنگی ہو گئی ہے۔" چیکو بولا

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"یہ لے پر جلدی کر۔" بھکارن نے کہا

پھر وہ تاڑی کی بوتل لے کر سڑک کے دوسرے کنارے کی طرف چل پڑی۔

میں اور منٹو سائے میں اس کا پیچھا کرنے لگے۔ منٹو غصے سے کھول رہا تھا۔

"کمبخت نہ صرف ٹھیکی بلکہ شرابی اور تاڑی پینے والی بھی نکلی"

اب بھکارن ایک نہایت بوسیدہ جھونپڑی کے پاس جا کے رک گئی تھی۔ جھونپڑی کی چٹائی کے سوراخوں میں سے دیئے کی روشنی جھلک رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کی میں اور منٹو بھی ٹھٹک کر رہ گئے۔ میرا بوٹ ایک پتھر سے ٹکرایا تو اس کی آہٹ سنتے ہی وہ چونک پڑی

"تم کون ہو۔۔۔؟" وہ سہم کر دھیمی آواز میں بولی جیسے

اسے ڈر ہو۔ کہ اونچی آواز میں بولی تو بستی کے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔

"کون ہو تم۔ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو—؟"

"اتنی جلدی بھول گئیں—" منٹو نے کہا۔

"میں ہوں منٹو— ہندوستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار— اور یہ ہے یوسف— میرا دوست— ہندوستان کا سب سے بڑا اور خوب رو اداکار— مگر ابھی اسے کسی فلم میں چانس نہیں ملا۔ لڑائی کر رہا ہے۔ تم نے اس سے ڈیڑھ روپیہ مانگا تھا نا— اور اب تم کو ڈیڑھ کی بجائے پانچ روپے مل گئے ہیں۔ اندھیری گلی کے ہوٹل سے۔"

"اچھا تو آپ یہاں کیوں آئے ہو—؟" اندھیرے میں بھکارن کی آواز سنائی دی۔ اور یوں محسوس ہوا جیسے بھکارن کا چہرہ غصہ اور شرم سے تمتما اٹھا ہو بڑی ہی کڑوی آواز میں پھر بولی۔

"تم نے تو ڈیڑھ روپیہ نہیں دیا تھا۔ جاؤ۔ چلے جاؤ— اب یہاں کیوں آئے ہو۔ میں کہتی ہوں کیوں آئے ہو"

"یہ دیکھنے کہ وہ کون سالا ڈاکٹر ہے جس نے تمہارے

باوا کے لئے یہ زہر کی بوتل لانے کو کہا ہے۔

بھکارن بولی ــــ "باوا بہت بیمار ہے بابو۔" ہسپتال لے گئی تھی انہوں نے داخل نہیں کیا۔ بولا انتڑیوں کا کینسر ہے۔ ولایت میں بھی اس کی کوئی دوا نہیں۔ بس یہ دارو ہی اس کا علاج ہے۔"

بھکارن نے منٹو کے شبہوں کو شاید بھانپ لیا تھا۔ پھر بولی۔

"بابو مجھ پر بھروسہ نہیں تو اندر چل کر دیکھ لو۔"

"تمہارا باپ اس جھونپڑی کے اندر ہے کیا؟" منٹو نے پوچھا

"ہاں اندر۔"

"اس کو آواز دو۔"

"بابا۔ بابا ــــ بھکارن نے آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ پھر چلائی۔

"بابا ــــ بابا۔ ــــ مگر سناٹے میں اس کی اپنی آواز ہی گونج کر لوٹ آئی۔

"بابا ــــ جواب کیوں نہیں دیتے۔" بھکارن نے کہا۔

"اس لیئے کہ تمہارا باپ ہے ہی نہیں —" تمہارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ بس اب یہ ڈھونگ رہنے دو۔"

وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑی کے اندر گئی ہیں اور منٹو اندھیرے میں واپسی کے لیئے راستہ تلاش کرنے لگے منٹو کا افسانہ مکمل ہو گیا تھا۔

ابھی ہم چند قدم ہی گئے ہوں گے۔ کہ ایک دل ہلا دینے والی چیخ سنائی دی۔ منٹو وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ لیکن میں اس جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے اندھیرے کی اس بستی کی ہیروئن نے اپنے ہیرو کو چیخ کر پکارا ہے۔ اور میں ہیرو بنزون تھا۔

اس چیخ کو سن کر وہاں کیسے ٹھہر سکتا تھا۔ سرپٹ ہو گیا اندر ایک جھلنگی کھاٹ پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ مردہ پڑا تھا۔ جھونپڑی کے دیئے کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں بھکارن کے پریشان بالوں نے اس کے چہرے کے گرد اندھیرے کا ایک ہالہ سا بنا دیا تھا۔ وہ کالے پتھر کی مورتی کی طرح چپ چاپ کھڑی تھی۔ گیٹ آف انڈیا کے پاس لارڈ ڈنکلس کے بت کی طرح فورٹ ایریا میں کالے گھوڑے کے بت کی طرح۔

میں نے کھاٹ پر پڑی بوڑھے کی لاش کو پھر بڑے غور سے دیکھا اس کی آنکھیں کھلی پڑی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک ہاتھ جو شاید درد کو دبانے کے لئے پیٹ پر رکھا تھا وہیں اکڑ کر رہ گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کی اینٹھی ہوئی انگلیاں اس کونے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ جہاں تاڑی کی خالی بوتلیں بھی پڑی تھیں۔

میرے منہ سے آواز نکلی جو میرے کانوں اور منٹو کے کانوں کو اپنی آواز معلوم نہ ہوئی وہ بھی بھاگ کر میرے پیچھے جھونپڑی میں گھس آیا تھا۔

"معاف کرنا۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔" منٹو نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"تم کو اب اور پیسوں کی ضرورت ہوگی ـــ یہ لو" منٹو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کا نوٹ نکالا اور بھکارن کو دیتے ہوئے پھر بولا

"میرے پاس تو بس یہی ایک نوٹ ہے۔" پیٹ میں شدید درد ہونے کی حالت میں بڑی مشکل سے ایک ایک بات کہہ کے

لئے ایک افسانہ بن کر تارڑی کے لئے پیدا کر رکھے تھے مگر تمہیں ان کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔

میں نے بھی منٹو کی طرح جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال لیا تھا۔

بھکارن نے بڑے غور سے دونوں نوٹوں کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے ان کو لینے سے انکار کر دیا۔

بولی ــــ

"اب مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ میں تو نوٹا نگ تارڑی کے لئے پانچ روپے میں بک گئی۔"

میں اور منٹو جیسے اندھیرے کے سمندر میں غوطے کھانے لگے تھے۔

"مجھے تارڑی سے نفرت ہو گئی ہے۔" اندھیرے میں منٹو نے جھونپڑی سے باہر سرکتے ہوئے کہا۔

"آج سے کبھی نہیں پیوں گا۔"

"اور میں بھی ــــ" میں نے بھی اندھیرے میں باہر سرکتے ہوئے کہا۔

تارڑی کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔

• یہ انتڑیوں میں کینسر کر دیتی ہے۔

• یہ پانچ روپے میں بک جانے پر مجبور کر دیتی ہے!

تاڑی ——— میں بڑلنے لگا۔

جل پریاں

بمبئی اتنا پیارا اور حسین شہر ہے۔ کہ اس کی دلچسپیاں ختم ہونے میں نہ آرہی تھیں میرے دن میری راتیں بس سیر و تفریح میں گزر رہی تھیں اس دن میں پالی ہل کی سیر کرنے جا رہا تھا۔

پالی ہل ـــــ

جسے بمبئی کا پرستان کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ستارے یہیں رہتے ہیں ـــــ ایکٹر اور ایکٹریس۔

سمندر پرسکون تھا۔ اور بے حد نیلا ـــــ دور بہت سی بادبانی کشتیاں ایک لمبی قطار میں پچھم کی طرف لہروں پر بہتی چلی جا رہی تھیں۔ نیچے سڑک پر چیکو اور ہرے ناریل بیچنے

والی گائنوں نے آواز میں لگانی شروع کر دی تھیں۔

سڑک کے پہلے چوک میں ایک مندر تھا۔ جس کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی گھاٹنیں کنول اور کیوڑے کے پھول بیچ رہی تھیں، مندر کے سامنے گھاس کے چھوٹے سے قطعے میں پپیتے کے چند پیڑ کھڑے تھے۔ سڑک پار کرتی ہوئی ایک گھاٹن کار سے ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچی اس نے سوتیا رنگ کی دھوتی اس قدر کس کر باندھی ہوئی تھی۔ کہ اس کے کولہوں کا ابھار۔ باہر جھانک رہا تھا۔ اوپر والے حصے پر صرف انگیا تھی۔ جس کا رنگ گہرا نیلا تھا اور اس کی کٹوریوں میں موتی پروئے ہوئے تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔ اونچی اونچی عمارتوں کی کہیں روک نہ تھی

سمندر کے کنارے تھوڑی دور ذرا نیچے اتر کر ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ شروع ہو گئے تھے۔ جو ساحل کے ساتھ ساتھ جوہو بیچ تک پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں آگے جا کر ٹروپیکل درختوں کے سایوں میں ہوٹل اور بنگلے جیسے کسی سپنے میں آباد تھے

اب میں اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ جہاں ورلی کی سڑک ہے

چھوٹا سا ایک راستہ ایک چھوٹے سے ٹاپو میں حاجی علی کی درگاہ کو جا رہا تھا۔ جو کہ جوار بھاٹے کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے۔

چھوٹا سا یہ راستہ جب پانی چڑھتا ہے۔ تو اس میں چھپ جاتا ہے۔ اور جب پانی اترتا ہے۔ تو یہ راستہ پھر ابھر آتا ہے۔ اور ادھر ادھر کے رکے ہوئے لوگ آنے جانے لگتے ہیں ———!

یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر درگاہ کے عقب میں مہالکشمی کے مندر کا کلس روشنیوں میں جگمگا رہا تھا وہاں بھی اچھی خاصی چہل پہل ہو رہی تھی۔ پجاری اور پجارنیں کانسی اور پیتل کے تھالوں میں کنول اور کیوڑے کے پھول لوبان اور سیندور لئے مندر کی سیڑھیوں پر پوجا کے لئے آجا رہے تھے۔ چبوترے میں گجر بج رہا تھا گھاٹنوں کی ایک ٹولی سر پہ ٹوکریاں رکھے ورلی کی سڑک کی طرف چلی جا رہی تھیں ٹوکریوں میں سانچی پان، پپیتے، ہرے ناریل اور ہری چھال کے کیلے تھے۔

مندر کے اندر چھوٹی چھوٹی بہت سی مورتیوں کے درمیان

دیوی کی مورتی تھی۔ کانسی اور پیتل کی مورتی ۔دیپ مالا کی روشنی میں اس کی آنکھ میں ٹنکا ہوا لال جگمگا رہا تھا دیوی کی آرتی اتاری جارہی تھی۔ میں تھوڑی دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد پھر آگے بڑھا۔

ایک جگہ سمندر کی لہریں دور سے بھاگتی آرہی تھیں اور ساحل کے اوپر سے گزر کر دور دور تک پھیلتی جارہی تھیں اور ایک جگہ پانی سے باہر نکلی ہوئی چٹانوں کے پاس گھاٹنیں نہا رہی تھیں پانی میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں چاند کی روشنی میں ان کے گیلے گیلے جسم چمک رہے تھے۔ وہ سب ننگی تھیں تیز تیز لہریں جب ان کی ٹانگوں سے ٹکراتیں۔ تو وہ ان پر سوار ہو کر ساحل کی طرف کھسکتی چلی جاتیں اور جب وہی لہریں ساحل سے ٹکرا کر واپس آتیں تو وہ ان پر سوار پھر اسی جگہ واپس آجاتیں وہ سب جل پریاں معلوم ہو رہی تھیں سانولے رنگ کی ننگی گھاٹنیں، جل پریاں — !!

پالی ہل
بمبئی کا پرستان

جب میں سیر سپاٹا کرتا پالی ہل پہنچا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ پالی ہل کی سڑکیں روشنی میں جگمگا رہی تھیں کسی بنگلے کی اوپر کی منزل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی تو نچلی منزل میں وائلن ستار۔ پیانو یا ہارمونیم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہاں ایک کیفیٹریا بھی تھا۔ شبرنیا۔

اور اس سے کچھ آگے ناٹ کلب ۔ میرینا کلب جس میں فلمسٹار اور اونچے طبقے کے لوگ تفریح کے لئے آتے رہتے تھے۔

میں ایک طرف ایک پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اور فلم سٹاروں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں نیو ماڈل کی ایک پیکارڈ کار آکر پارک میں رکی تھی۔

پیکارڈ میں لیلا چٹنس، سادھنا بوس، مہتاب اور سوبھنا سمرتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ اشوک کمار بھی تھا یہ سب کار سے اتر کر کلب میں چلے گئے۔

اتنے میں ایک اور کار پارک میں آکر رکی۔ نیو ماڈل چلائی ماوتھ سیپارنگ کی۔ اس میں پری چہرہ نسیم، ثریا اور ستارہ بیٹھی تھیں۔ یہ بھی کار سے اتر کر کلب میں چلی گئیں۔

اب جو کار آئی نیو ماڈل کیڈلک تھی۔ اور اس میں بس اکیلی سیتا دیوی بیٹھی تھی۔ اور خود ہی کار چلا رہی تھی وہ بھی کار سے اتر کر کلب میں چلی گئی۔

اس کے بعد جو کار آئی نیو ماڈل بیوک تھی۔ اور اس میں جال مرچنٹ مس زبیدہ کے ساتھ بیٹھا تھا

اس کے بعد جو کار آئی اس میں سلوچنا تھی خاموش فلموں کی عظیم ایکٹریس جو ٹاکی فلموں میں بھی کام کیا۔ اور بڑا نام

پایا۔ کسی زمانے میں مس سلوچنا سکرین کا چاند تھی۔

اس سے زیادہ حسین ایکٹریس اس زمانے میں فلم انڈسٹری پیش نہ کر سکی۔ جس وقت میں نے مس سلوچنا کو دیکھا اس کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن اب بھی اس میں کافی جادو تھا۔

اب جو کار سپارک میں آکر رکی اس میں ایک اور پرانی ایکٹریس مس مادھوری بیٹھی تھی۔ اس زمانے میں سلوچنا کے بعد اگر کوئی ایکٹریس سکرین کا پھول تھی تو وہ مس مادھوری تھی۔ ای بل موریا کے ساتھ فلموں میں آیا کرتی تھی جس زمانے میں میں نے اسے پہلی بار دیکھا اس کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن اس وقت بھی بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

اب ایک اور کار آئی۔ اس میں مدھوبالا، نین تارا، مس گلاب، مس کوپڑ اور ان کے ساتھ مودک بھی تھا۔ یہ بھی سب کار سے اتر کر کلب میں چلے گئے۔

اس کے بعد ایک مرسیڈی آئی جس میں صادق علی، مظہر خان، یعقوب، چارلی، ڈیکشٹ تھا۔

اس کے بعد ایک اور کار آئی جس میں تنہا چندر موہن بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک اور کار آئی جس میں گنجا ئن جاگیردار

ڈائرکٹر جے، کے، نندہ، سیٹھ کرنانی، اور درگا کھوٹے بیٹھی تھی۔

اور پھر ایک کے بعد ایک آٹھ کاریں اور آئیں جن سے یہ فلم اسٹار باہر نکلے۔ للتا پوار، مایا بینرجی، سادھنا بوس، رتن پربھا۔ کرن دیوان۔ کے این سنگھ، مس سلوچنا چٹرجی بیگم پارہ، شیخ مختار، پروڈیوسر ڈائرکٹر سی آر گولانی، روزوری، مس روزی، سہگل۔ اوما۔

ان لوگوں کا داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا جو کلب کے ممبر نہ تھے ٹکٹ تھا پچیس روپے میں نے ٹکٹ لیا اور پھر اندر چلا گیا۔

اس وقت آدھی سے زیادہ ننگی رقاصہ ناچ رہی تھی، ساز بج رہے تھے۔ ایلورا اور ایجنٹا کے غاروں کی کوئی حسین مورتی کتنا لچک کتنا لوچ تھا اس کے جسم میں۔

معلوم ہوتا تھا وہ ربر و ریشم کی بنی ہوتی ہے۔ بس ربر ہی ربر اور ریشم ہی ریشم تھا۔ اس کے گلابی گوشت میں ہڈی نہ تھی اور اس کے رگ پٹھوں میں جیسے اسپرنگ لگے ہوئے تھے جھومتے ہوئے جھولتے ہوئے ڈولتے ہوئے ڈگمگاتے ہوئے کبھی آگے

کبھی پیچھے ، کبھی دائیں کبھی بائیں ، اپنے جسم کو نامعلوم طریقوں پر مختلف سمتوں سے جھکاتے ہوئے موڑتے ہوئے وہ جادو جگا رہی تھی۔

اور پھر ایکا ایکی دھنک سی روشنیوں کے پھیلے پھیلے دائرے ربر و ریشم کی تھرکتی ، لچکیلی گڑیا پر سمٹنے لگے۔ مینڈولین وائلن گٹار اور دوسرے سازوں کی لے پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی ۔ !

ایکا ایکی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ آدھی سے زیادہ ننگی رقاصہ چھاتیوں کو تھرکاتے ، کولہے مٹکاتے ، رانوں کو پھڑکاتے فرش کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک حصے سے دوسرے حصے تک ــــ دھنک سی روشنیوں کے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں تتلی کی طرح آتی تو ہال تالیوں سے گونج گیا۔

اسی اثناء میں رقاصہ سنگ مرمر کے فرش پر لیٹ کر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے انڈر ویئر تک ننگی ٹانگوں کو چھت کی طرف اٹھائے یوں ہلانے لگی جیسے کہ سائیکل چلا رہی ہو۔

ناچ کے بعد آرکسٹرا کے سازوں نے ایک سازینہ پیش کیا اس کے بعد سب کی فرمائش اور پر زور اصرار پر سہگل نے مائیکروفون پر دیوداس فلم کا ایک گیت سنایا۔

کلب کے اوپر چودھویں کا چاند جھکا ہوا تھا۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں ساحلوں پر لرزتے سائے بڑے سہانے معلوم ہو رہے تھے ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ تھوڑی دور اونچی ہوئی چٹانوں کے اس پار تک سمندر پر چاندنی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

تاردیو اور قلابے کی طرف بڑھتی ہوئی کنکریٹ کی سڑک کے سامنے اور پیپتے کے درختوں اور انگور کی بیلوں میں چھپی ہوئی مرینو کلب جاپانی قندیلوں اور بتیوں سے جگمگا رہی تھی۔ کلب کے زینے کی قالین والی گیلری سے ذرا آگے ایک کمرے کے دریچے میں ایک لڑکی چپ چاپ کھڑی باہر درختوں سے پرے سمندر کے کنارے کنارے چکر کاٹتی ہوئی کنکریٹ کی سڑک کو دیکھ رہی تھی وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

دریچے کے باہر انگور کی بیل کے پتے اور ان میں لٹکتے

ہوئے ہرے ہرے خوشے سمندر کی بھیگی بھیگی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ نیچے مرینو کلب کے صحن میں حوض میں فوارہ اچھل رہا تھا۔ اور بالکونی میں بینڈ کے سازوں نے رات کا ایک دھیما نغمہ چھیڑ دیا تھا۔

بالکونی سے تھوڑی دور کیلوں کے جھنڈ میں فلم اسٹاروں کا ایک گروپ بیٹھا تھا۔ یہ سب اس دن پونا سے ریس کھیل کر آئے تھے۔

ان کے پاس کیمرے اور دوربینیں تھیں وہ سب کے سب گھوڑوں اور جاکیوں کی باتیں کر رہے تھے۔ ہار جیت کی باتیں کر رہے تھے۔

"میں دیوالی کو ضرور پونا جاؤں گا۔ اور ہیوی اسٹیک کروں گا"

فلم اسٹاروں کے گروپ میں بیٹھے ایک مارواڑی ٹھاٹھ میں بولا۔

"اپن تمہارے ساتھ جائیں گا سیٹھ" گجراتی لڑکی ہنستے ہوئے بولی

وہ گجراتی لباس میں تھی۔ ہلکے ریشمی رنگ کی ساڑھی،

میں ریشم کے پھول — اس نے جوڑے میں کنول کا پھول لگایا ہوا تھا۔

"سالہ جانی واکر گھوڑا فلاپ۔ اپن سالا فلاپ بیس ہزار روپیہ سالا فلاپ — صبح اپن فیورٹ سالا ٹپ دے گا" میمن سیٹھ نے کہا۔

جس کا رنگ سانولا اور قد بہت چھوٹا تھا۔ جودھپوری اچکن اس کے بے ڈھول جسم پر بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

ساتھ والی میز پر ایک مرہٹن لڑکی موک فلسٹار کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ اس دن پنجابی لباس پہن کر شاید پنجابی معلوم ہونے کے موڈ میں تھی۔ شلوار قمیض کا بادامی ریشمی سوٹ اور اس پر نیلی جارجیٹ کا دوپٹہ، بوٹا سا قد۔ گالوں پر روژ کا ہلکا سا ٹینٹ دانت سفید چمکدار اور ہموار، چمکیلے بال بہت سی گرہوں میں پیچھے بندھے ہوئے

گل یاسمین، کوہ نور۔ سلور کنگ۔ ڈکن کوئین

"رابن ہڈ۔ ڈم ڈم!" یہ راجکماری اودھے نگر کی آواز تھی۔ جو اپنے راجواڑے کے مخصوص شاہی لباس میں تھی اور اشوک کمار کے ساتھ ہنس ہنس کر گھوڑ دوڑ کے

گھوڑوں کی باتیں کر رہی تھی۔ جو کل پونا میں دوڑنے والے تھے۔

"سلور کنگ کا میں نے ایک لاکھ آفر کیا ہے۔ بڑا اچھا گھوڑا ہے، ہمیشہ ون آتا ہے۔" یہ راجکمار دھاون گڑھ کی آواز تھی جو مادھوبالا کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

کتنی دلکش تھی مرینو کلب کی وہ الف لیلوی رات جب فلمسٹار شیمپین پینے لگے تو میں نے بھی بیرے کو شیمپین لانے کا آرڈر دے دیا۔

چمپی والا

میں تو گھر سے ابّا جان کا فقط دو ہزار روپیہ لے کر بھاگا تھا اور بمبئی کی رنگ رلیوں کے لئے تو دو کروڑ روپے بھی بہت کم کہے جا سکتے ہیں۔ دو ہزار روپیہ میں نے دنوں میں برابر کر دیا۔ اور میں جس کام کے لئے بمبئی آیا تھا ادھورا پڑا تھا۔

میری منزل ابھی کافی دور تھی۔ میں رنجیت مووی ٹون۔ ایجنٹا مووی ٹون۔ اور ساگر مووی ٹون میں کئی بار جا چکا تھا۔ جہاں ڈائرکٹر اور پروڈیوسر میری طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکے تھے۔ ٹال مٹول کرتے

تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ سفارش کے بغیر کام نہیں چلے گا اور سفارش کوئی مل نہ رہی تھی۔ اور جیب بالکل خالی ہو چکی تھی۔ کرڑکی میں میرا دوست اعجاز جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا میری مدد کر رہا تھا۔ مگر وہ کوئی رئیس آدمی تو تھا نہیں تنخواہ کا تیسرا حصہ گھر بھیجتا تھا۔ اور ایک حصہ اپنے گزارے اور کرائے کے لئے رکھ لیتا تھا وہ میری کب تک مدد کر سکتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے کندھوں پر بوجھ بن رہا ہوں۔ میں ایک دن چپکے سے وہاں سے بوریا بستر اٹھا کر بھنڈی بازار کی حاجی سرائے میں آگیا۔ وہاں مجھے فقط ایک روپیہ کمرے اور چارپائی کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ رہا کھانے پینے کا معاملہ تو میں نے بھنڈی بازار کے غریب ہوٹل کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا اس کا مالک اچھا آدمی تھا ادھار سدھار کر لیتا تھا۔

اسی دوران میں میں منٹو کے ساتھ ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا۔ کہ اس کے ساتھ مشورہ کرنا چاہیئے ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں اس کے بتائے ہوئے پتے

پر پہنچا۔ تو وہ معلوم ہوا کہ کسی ضروری کام سے لاہور جا چکا ہے۔ اور معلوم نہیں کب واپسی ہو گی۔ میں سخت مایوس ہوا۔ حالت بڑی پتلی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو آنند بھون میں چل کر کامنی سے ملنا چاہیئے۔ اُسے کوئی داؤ پیچ مارنا چاہیئے۔

سیٹھ کی بیٹی تھی۔ مجھے بڑا پیار کرتی تھی۔ میں جلدی سے آنند بھون پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ دارجلنگ کی سیر کرنے چلی گئی ہے۔ سردیوں میں واپس لوٹے گی۔

یہ سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سوچوں کے تانے بانے الجھاتا سلجھاتا واپس لوٹا سرائے میں واپس آ کر بیٹھ گیا اعجاز کے پاس تو میں اب جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اب میں اپنا بوجھ اس کے کندھوں پر رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے شرم آتی تھی کہ اعجاز کیا کہے گا۔ کہ میں چھپکلی کی طرح اسے چمٹ ہی گیا ہوں مہمان ایک دن کا دو دن کا حد تین دن کا اور میں تو متواتر تین مہینے اسی کی روٹیاں ٹھونستا رہا۔ اس کے باوجود کہ

اعجاز نے مجھے تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی مجھے نہ پا سکا۔ بمبئی ایک ایسا گنجان شہر ہے۔ اور اتنی زیادہ آبادی ہے۔ کہ کسی شخص کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں ہے بہرحال میں اعجاز سے چھپتا چھپاتا رہا۔ اور حالت دن بدن بڑی پتلی ہوتی گئی۔

بڑی سخت کڑکی۔

نوبت فاقوں تک آ پہنچی۔ غریب ہوٹل اور سرائے کا کرایہ اتنا ہو گیا کہ دونوں جگہوں سے نوٹس مل گیا کہ آج سے ادھار بند۔ پچھلا حساب صاف کرو۔ نہیں تو گول ہو جاؤ یہاں سے۔

میں بڑی پریشانی میں تھا۔ کہ اچانک میری ملاقات ایک دن ایک چمپی والے سے ہو گئی۔ چمپی والا بمبئی میں مالش کرنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ چمپی والا سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔ انور تھا اس کا نام ——— ہٹا کٹا گورا چٹا نوجوان، خوبصورت، پڑھا لکھا۔ یہ بھی میری طرح ایکٹر بننے کے لئے گھر سے روپے چرا کر بمبئی بھاگ آیا تھا۔ لیکن کسی فلم میں چانس نہ مل سکا۔ تو فاقہ مستی نے

اسے مالش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور بمبئی میں ایسے چلتے پھرتے ٹھنڈے اور گرم حمام بھی ہیں جو مسکا پالش بھی کراتے ہیں۔ اور مسکا پالش کیا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ کو تھوڑی دیر میں۔

چند ہی دنوں میں انور میرا گہرا دوست بن گیا۔ فاقہ مستی سے بچنے کے لئے اس نے مجھے بھی چمپی والا بنا دیا بمبئی میں چلتے پھرتے ٹھنڈے گرم حماموں میں مالش اکثر رات کے وقت ہی ہاتھ میں مونگ پھلی کے تیل کی شیشی لئے اور کندھوں پر سفید تولیہ ڈالے گلیوں اور بازاروں میں ہانکا لگاتے پھرتے ہیں۔

چمپی والا بنے وہ میرا پہلا ہی دن تھا۔ انور مجھے اپنے ساتھ فارس روڈ کی طرف لے گیا۔ جہاں رنڈیاں بیٹھتی ہیں۔ اور پھر وہاں سے ہٹ کر ہم کماٹی پورہ کی طرف نکل آئے۔ اور گلیوں میں ہانکیں لگاتے ہی چلے گئے۔

"چمپی والا ۔۔ چمپی والا"

سامنے ایک بہت بڑی بلڈنگ تھی۔ اور اس کے ساتھ

ہی ایک بہت بڑی بلڈنگ۔

اب جو ہم نے ہانکا لگایا تو ایک ہی وقت میں دونوں بلڈنگوں میں دو کھڑکیاں کھلیں اور پہلے ایک عورت کی آواز آئی۔

"اے چمپی والا ادھر آؤ۔۔۔"

اس کے فوراً ہی بعد ایک مردانی آواز سنائی دی۔

"چمپی والا اوپر چلو۔۔۔ اوپر چلو۔"

میں نے نظر اٹھا کر باری باری ان کھڑکیوں کی طرف دیکھا تو عورت اور مرد دونوں مجھے اوپر آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ لیکن میں ایک ھی وقت میں دونوں کی مالش کیسے کر سکتا تھا۔ میں نے انور سے کہا۔

"لو یار انور تم سیٹھ کی چمپی کرو۔ اور میں سیٹھانی کی چمپی۔۔۔"

"ارے نہیں یار تم ادھر چلو میں ادھر چلتا ہوں"

انور نے جواب دیا۔

وہ سیٹھانی کی چمپی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے تو سیٹھ کی صورت دیکھتے ہی گھن آنے لگی تھی۔ موٹا تازہ گول گپا

بڑا ہی بدصورت انسان۔ اور اس کے ساتھ والے مکان
سے جھانکتی ہوئی سیٹھانی بھی سبز پری نہ تھی۔ وہ بھی خوب
موٹی تازی تھی — بارہ من کی دھوبن۔ رنگ سانولا
لیکن چہرہ کچھ اچھا تھا۔

میں اور انور آپس میں الجھ پڑے وہ چاہتا تھا کہ
سیٹھانی کی چمپی وہ کرے اور میں چاہتا تھا کہ میں کروں
عجب الجھن تھی۔

آخر بہت جلدی ہم نے فیصلہ کیا۔ کہ ٹاس کر لیتے ہیں
جو ٹاس جیت جائے سیٹھانی کی چمپی کرے۔

انور نے جلدی سے ایک کھوٹی ادھنی جیب سے نکال کر
ہوا میں اچھالی تو میں نے کہا۔

"زنجیر —"

انور بولا

"میم —"

اور پھر جب ادھنی زمین پر گری تو ہم جلدی سے نیچے
جھک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ میں ٹاس
جیت گیا تھا۔ زنجیر آئی تھی۔ بس اب کوئی رکاوٹ

"نہیں۔" انور نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔

"ارے تیری قسمت کی ایسی تیسی"

اور وہ چپکے سے دوسری بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جبکہ میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو سامنے ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے آواز تو نہ دی لیکن کھانسنے لگا۔ تاکہ سیٹھانی کو معلوم ہو جائے۔ کہ میں اوپر آگیا ہوں۔"

"اندر آؤ۔ چھپے والا اندر آؤ۔"

اور میں جلدی سے کمرے میں سرک گیا۔ جو بڑا سجا ہوا تھا۔ اس کے فرش پر بڑا قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ اڑن کھٹولے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جس کے نیچے چھپرکھٹ پڑی ہوئی تھی اور اس کے اوپر بارہ من کی دھوبن سیٹھانی۔ دائیں طرف ایک تپائی رکھی تھی۔ جس پر پلیٹ میں پھل تھے ان پھلوں میں ایک آم بھی تھا۔

مجھے دیکھتے ہی سیٹھانی چھپرکھٹ سے اتر کر قالین پر سیدھی سپاٹ کھڑی ہوگئی۔ اور قالین کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے بولی۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں قالین پر بیٹھ گیا۔ تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ساڑھی اتار کر چھپر کھٹ پر پھینک دی نیچے انڈرویئر تھا۔ اس کی رانیں اور پنڈلیاں ایسی تھیں جیسے مگدر اب اس نے قمیض بھی اتار دی تو نیچے انگیا تھی۔ اور اس کے بازوؤں پر مسل ابھرے ہوئے تھے۔ اور چھاتیاں جیسے ڈھائی ڈھائی من کے ڈمبل۔ توبہ عورت نہیں پہلوان سینڈو۔

میرا تو سانس پھول گیا میں نے دل میں کہا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں انور سے تاش ہار جاتا۔ میں گھبراہٹ میں ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ تو سیٹھانی نے کسی قدر تند لہجے میں کہا۔

"اے چھوکرا۔۔۔ الو کا مانک آج باجو کیا دیکھتا چلو مالش کرو۔۔۔"

"سیٹھانی جی آپ کا قالین خراب ہو جائے گا تیل سے" میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"ارے ناہیں چھوکرا ـــ کچھ بھکر کا بات ناہیں۔ تم اکھا چمپی چالو کرو ـــ" اس نے کہا اور سنسار کی طرح قالین پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئی۔

میں نے آج تک کبھی کسی کی مالش نہ کی تھی۔ اور نہ کبھی مالش کرائی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ مالش سر کی طرف سے شروع کروں یا پیروں کی طرف سے پس ہتھیلی پر تیل ڈال کر سر کی طرف بڑھا تو اس نے ٹوک دیا اور بولی۔

"ارے چھوکرا تم اکھا بنڈل چمپی والا ہے۔ مالم ہوتا تم کو چمپی کا دھندا نہیں آتا۔ اس باجو چلو۔"

اتنا کہتے ہی اس نے مجھ کو گردن سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں ٹانگوں کی طرف کر دیا۔ جیسے کوئی چوزے کو پکڑ کر ڈربے کی طرف اچھال دے چار سو چالیس وولٹ کی پاور تھی۔ نامراد میں۔ جھٹکا کھا کر میں ادھر منہ کے بل گرنے کو تھا مگر سنبھل گیا اور جلدی سے سیدھا ہو کر دونوں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ تو اس نے اپنی ایک ٹانگ جھٹ سے ہوا میں ہلائی۔ جو میرے ایک کندھے پر رہگی

اور میں لڑھک کر دھم سے نیچے گرتے ہی قلابازی کھا گیا جیسے
نامراد کی ٹانگ نہیں لوہے کا ایک بھاری بھرکم گارڈر
" چھوکرا۔ اکھا پھوکر۔" وہ پھر بجلی کی طرح چمکی
" اسے چھوکرا کچھ کھاتا پیتا ناہیں۔"
اور میں بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگ اٹھا
وہ بھی میرے پیچھے بھاگی۔ اور ابھی میں نے نیچے اترنے کے
لئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس نے مجھے گردن
سے پکڑ کر یوں پیچھے کھینچ لیا جیسے کرین کسی معمولی سی
چیز کو اپنے شکنجے میں پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے۔ اور
میں مرغی کی طرح قیں کر کے وہیں رہ گیا۔ چھٹکارا مشکل
تھا۔ جب میں بچ بچا کر کے نیچے اترا تو یوں ہانپ رہا تھا
جیسے میلوں وہ چلچلاتی دھوپ میں دوڑتا آ رہا ہوں سانس
میں سانس نہیں تھا۔ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میرا دم گھٹ
رہا تھا۔ جیسے میں گرم حمام سے نکلا تھا۔
انور ابھی سیٹھ کی بچی کر کے نیچے نہیں آیا تھا میں
بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تو تھوڑی
دیر میں انور بھی نیچے آیا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا ۔

تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ڈگمگا رہا تھا۔ میرے قریب آ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ارے سالے یوسف مروا دیا تو نے میری تو قلفی جم گئی ہے۔ ٹھنڈا حمام"

"ارے سالے تو نے بھی میری ڈھبری ٹیٹ کروا دی ہے گرم حمام ——" اسی لہجے میں میں نے جواب دیا۔

"ارے سالے کیا دیا تجھے سیٹھانی نے ——" انور نے پوچھا

"تو بتا تجھے کیا ملا سیٹھ سے ——" میں نے پوچھا

"دس روپلی۔" انور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا

"اور ادھر بھی دس کا پاپلہ ہے۔" میں ہانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جلدی چلو۔ میں تو اب گرم گرم چائے پیوں گا" انور نے کہا۔

"اور میں پیوں گا ہرے نائیل کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی۔ میری تو ساری اسٹیم نکل گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"بمبئی میں چمپی کرنے والے عام گاہک سے ڈیڑھ یا دو روپے لیتے تھے۔ اور سیٹھ ساہوکاروں سے پانچ روپے

اور اگر چمپی والا چمپی سے سیٹھ یا سیٹھانی کو خوش کر دے تو وہ دس یا پندرہ روپے بھی دے دیتی ہے۔

"ارے اب چل بھی دے ہمیں کو ـــــ" انور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارے ذرا سانس میں سانس تو آ لینے دے" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

اتنے میں ادھر ایک اور چمپی والا ہانک لگاتا آ گیا

چمپی والا ـ چمپی والا

بلڈنگ کی کھڑکی پھر کھٹ سے کھلی اوپر سے سیٹھانی کی آواز آئی۔

"چمپی والا۔ چمپی والا۔ اس باجو چلو"

سیٹھانی کی آواز سنتے ہی میرے سانس کی ٹھیک ہوتی ہوئی رفتار پھر خراب ہو گئی۔ پہلا پسینہ ابھی سوکھا ہی تھا کہ اوپر سے اور پسینہ آ گیا۔

میں بھاگنے لگا تو انور سیا لکوٹیا اچھل کر میرے کندھے پر سوار ہو گیا۔ اس سے بھاگا نہیں جا رہا تھا وہ ابھی تک تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا بدن برف کی

طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے اسے ایک طرف جھٹکنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ تو مجھ سے یوں چمٹ گیا تھا جیسے بندریا کا بچہ اس سے چمٹ جاتا ہے۔ بس اسے اٹھا کر بڑی مشکل سے بھاگ سکا اور بھاگا بھی یوں جیسے کنگرو بھاگتا ہے۔

سینڈو سیٹھانی کے قہقہے کافی دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔

ہا ہا ہا ۔۔۔۔ !!!

ہا ہا ہا ۔۔۔۔ !!!

رمجو بنڈل
عرف
پرنس آف چوپاٹی

بس اب میں اور انور روزانہ رات کو چمپی کرنے نکل جاتے انور کی طرح میں نے بھی چمپی والوں کا لباس سلوا لیا تھا ململ کی قمیض اور ململ کی شلوار پاؤں میں ہوائی چپل اور ہاتھ میں مونگ پھلی کے تیل کی شیشی۔ کندھے پہ سفید تولیہ اور جیب میں ایک کنگھی۔

واپسی پر میں یہ لباس اتار دیتا تھا۔ اور نہا دھو کے دوسرا لباس پہن لیتا۔ کم سے کم تیس پینتیس کی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور وقت مزے سے گزرنے لگا۔ سرائے کا کرایہ

اور غریب ہوٹل کا بل بھی چکا دیا۔

اور پھر ایکا ایکی ایک دن مجھے بخار آ گیا۔ جس نے متواتر مجھے پانچ دن پریشان کیا۔ میری جیب میں کل پندرہ آنے رہ گئے۔

دل میں آئی گیٹ آف انڈیا چلنا چاہیئے۔ ہوا خوری کے لئے۔ راستہ میں ہفتہ وار فلمی اخبار فلمستان کا تازہ پرچہ خرید لیا۔ پاسنگ شو کی ایک ڈبیہ ایک ماچس خریدی۔ کالا کا کرڑا پان کھایا۔ پندرہ آنے برابر ہو گئے۔

پیدل گیٹ آف انڈیا۔

سمندر کے کنارے ایک بنچ خالی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ گیا اور فلمی اخبار دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ایک کالا کلوٹا گرانڈیل نوجوان ایک طرف سے نمودار ہوا۔ دھاری دار رنگ برنگی چست بنیان اور نیلے رنگ کی پتلون۔ پاؤں میں فل بوٹ گلے میں ایک رنگین رومال شکل وصورت سے غنڈہ اور پاکٹ مار معلوم ہوتا تھا۔ میں اس وقت سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ گھر سے چلا تھا تو دو گرم اور تین ٹھنڈے سوٹ تھے میرے پاس،

بڑھیا والے۔ بمبئی میں وقتاً فوقتاً ان دنوں ٹھنڈے سوٹ استعمال کر رہا تھا۔ کہ ابھی گرمی کا موسم تھا۔ بمبئی بندرگاہ ہے جس کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ گرمیوں میں نہ بہت گرمی اور سردیوں میں نہ بہت سردی ـــ درمیانہ سا موسم ـــ

وہ گرانڈیل نوجوان میرے قریب آ کر بنچ پر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"جرا ماچس واچس ہوئیں گا۔ بابو تمہارے پاس۔"

میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جیب سے ماچس نکالی اور اسے دیتے ہوئے پھر فلمی اخبار پڑھنے لگا

"ماچس کے واسطے ایک سگرٹ بھی مل جائے گا بابو؟"

اس نے مسکرا کر گھگھیاتے ہوئے کہا۔

میں نے فلمی اخبار سے چہرہ ہٹا کر غور سے اسے دیکھا اور جیب سے پاسنگ شو کی ڈبیا نکال کر اسے سگریٹ دیتے ہوئے کہا۔

"شوق کرو سیٹھ صاحب ـــ"

"تم برا گڈ مین شٹنٹی ٹن مالم ہوتا بابو ـــ" سگریٹ

لے کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ماچس کو زور سے جلایا تو ایک چنگاری نکل کر بجھ گئی۔

"اوہ بابو ــــ یہ سالا تمہارا ماچس کھوٹی ہے۔ سالا جلتا کم اور دھواں جیاستی چھوڑتا ہے۔ ذری تم جلاؤ۔" اس نے کہا۔

میں نے ماچس اس کے ہاتھ سے لے کر جلائی اور جب میں اس کا سگریٹ جلانے لگا۔ تو اس نے بڑی استادی سے اپنا ہاتھ میری جیب میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی نرمی سے کہا۔

"دوست یہ خالی ہے۔ بالکل خالی۔ کوئی بھری ہوئی جیب دیکھو ــــ"

اس نے میرا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے مضبوطی سے اس کی کلائی کو پکڑے رکھا۔

"گھبراؤ نہیں دوست ــ میں تم کو نیلی پگڑی والے کے حوالے نہیں کروں گا۔ تسلی سے بیٹھے رہو۔ تم بڑے ہی مزے کے آدمی ہو ــ"

"ہم تم کو اچھا گلت سمجھا بابو ـــــ ہم کو معافی دیو ہم سالا بھری سوری فیل کرتا پڑا۔ ہم پارڈن مانگتا مری مانگتا ـــــ" اس نے کہا۔

"تم مری مانگتا اور ہم تمہارا شاگردی کرنا مانگتا ـــ" میں نے کہا۔

"اوچا ـــ ہم سمجھا ناہیں ـــ سالا تم کیا بولتا پڑا ہے" اس نے کہا۔

"ہم بولتا ہے ہم تم سے یہ دستکاری سیکھنا مانگتا۔ ہاتھ کی صفائی ـــ" میں نے کہا۔

"اچھی اچھا ـــــ تم بابو لوگ ـــــ تم سالا کیسے یہ کام کرنا سکتا ہے" اس نے کہا۔

"ہم برو بر میں کرنا سکتا دوست ـــ کیا نام تمہارا" میں نے پوچھا۔

"اپن کا نام رمجو بنڈل ـــ پرا کھا بمبئی سالا ہم کو پرنس آف چوپاٹی بولتا۔" رمجو بنڈل نے کہا۔

"بس تو ہز ہائی نس تم ہم کو اپنا شاگرد بنالو۔ ہم بہت تنگ آگیا ہے۔ اس زندگی سے ـــ" میں نے کہا۔

"اوہ تم سالا ہم پر چوٹ مارتا ہے۔ اپن سمجھ گیا۔" رجّو بنڈل نے کہا۔

"نہیں چوٹ نہیں۔ ہم سالا تم سے جیاستی کٹ کا ہے۔ اِدھر دو مہینوں سے فلم میں نوکری کرنا مانگتا۔ سیٹھ لوگ چانس نہیں دیتا۔" میں نے کہا۔

"پن کے بابو۔ پاکٹ مارنا بڑا نرم ہے۔ کرائم ہے۔" رجّو بنڈل نے کہا۔

"تم سالا ٹھیک بولتا ــــ ہمارا تمہارا پاکٹ مارنا جرم ہے۔ اس لیے کہ ہم ہاتھ کی صفائی سے۔ ریزر سے بلیڈ سے۔ قینچی سے پاکٹ کاٹتا۔ لیکن یہ جو بڑی توند والا سیٹھ ہوتا ہے نا ــــ؟"

"ہاں ہاں ــــ!"

"وہ قینچی، ریزر، بلیڈ، استعمال نہیں کرتا۔ بلیک کرتا ہے۔ چور بازاری کرتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور قانون کی آنکھ میں دھول جھونک کر بڑی صفائی سے جیب کاٹتا ہے۔ کر جیب بھی نہیں کٹتا۔ جیب والا بھی نہیں کٹتا۔ اس کے مال کا پتہ نہیں چلتا ہے

یہ سنتے ہی رجو بنڈل نے بڑے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا

"یار تم سالا بڑے مجے کا آدمی۔ ویری گڈ مین شنیٹی مین،" آج سے تم اپن کا فرینڈ۔ تم سالا ہم کو پونا میں ملتا تو اپن تم کو سیٹھ بنا دیتا۔ تم سالا ادھر ملا۔ ادھر تو اپنا بڑا خانہ خراب ہو گیا۔ بڑا الو مانگ لائف۔ روٹی کیا کھانے کو بائٹ نہیں ملتا۔ ارے کوئی پھکر کا بات نئیں اپن فرینڈ مانگ تمہارا ہیلپ کرے گا۔

اتنا کہتے ہی رجو بنڈل نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اسے میری جیب میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ روک لیا تو وہ غصے میں کہنے لگا۔

"بائی گارڈ۔ تم اپن کا ہاتھ نا ہیں روکو اپن تم کو فرینڈ بولا۔ تم فرینڈ کا ہیلپ نئیں لیں گا۔ تو اپن تمہاری لائف کا دشمن بن جائے گا۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ تم نے موالی کا فرینڈ شپ نہیں دیکھا۔ اپن سالا بھی بہت گڈ مین شنٹی مین ہوتا۔ اکھا چنٹی پنٹی۔ رجو

بنڈل نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں دوست - ایک موالی - ایک دادا - ایک غنڈہ بھی انسان ہے - اگر اسے اچھے راستے پر لگایا جائے تو وہ اپنی برائی چھوڑ سکتا ہے - اگر اسے سماج میں شریف شہری بنا کر رہنے کی کوشش کی جائے تو وہ بھی شریف شہری بن سکتا ہے"

میں نے کہا۔

"اب تم جیاستی جیسی پٹاخ نہ کرو بابو - ہمارا بھیجا نکو کھاؤ - اپن تمہارے کو ادھر دادر میں لے چلیں گا" رجو بنڈل نے کہا

"کس کے پاس ــــ؟" میں نے پوچھا

"منگو دادا کے پاس ــــ وہ سالا فلم کمپنیوں کا چودھری ہوتا - لونڈے لونڈیاں فلم میں کام کرنے کو رے جاتا ہے"

"اچھا ــــ"

"ہاں ــــ سیٹھ لوگ اس کی سب بات مانتا منگو دادا سالا اپن کی ہر بات مانتا - دادا گیری اس کو اپن نے سکھایا ــــ" رجو بنڈل نے کہا۔

"بس تو پھر تم منگو دادا کو بولو کسی سیٹھ کو بولے:

سالا ہم کو چانس دے۔ اپنی فلم میں ـــــ" میں نے کہا۔

"اپن ضرور بولے گا۔"

"بس تو پھر میرا کام ہو جائے گا۔"

"ضرور ہو جائیں گا۔" رجو نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا

"چلو اپن کے سنگ چلو ـــــ ابھی ذرا وسلی کا چکر لگائیں

گا۔ کوئی بڑا پاکٹ ماریں گا۔ اپن تم کو ففٹی دیں گا۔

"نہیں نہیں رجو دوست یہ برا کام ہے۔" میں نے کہا

"ارے جاؤ نے ـــــ نائیں کچھ برا نائیں کچھ اچھا سالا

گول مارکیٹ میں سب چلتا۔"

اور رجو نیڈل مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے

گانے اور ناچنے لگا۔

اونچی نیچی راہوں میں پائل ہوری چھنکے۔

ایکسٹرا یونین

فلمی ممی خانہ

دوسرے دن تارمجو بنڈل مجھے اپنے ساتھ لے کر داور مین روڈ پر ایکسٹرا سپلائر یونین کے دفتر میں پہنچا۔ جس کا کرتا دھرتا منگو دادا تھا۔

منگو دادا ـــــ جس کے دو نام اور بھی تھے راسٹیش دادا۔ دادا گنجا ـــ جو فلمی دنیا میں بڑا مشہور تھا۔ ایک ایکسٹرا سپلائر تھا۔ کمیشن پر فلم کمپنیوں کے لئے ایکسٹرا مہیا کرتا تھا۔ ہر ایکسٹرا کو اسٹوڈیو سے جو کچھ ملتا تھا اس میں سے آدھا دادا کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ اس نے ایکسٹرا یونین کے نام سے ایک دفتر کھولا

ہوا تھا۔ یہ بھی ایک کاروباری اسٹنٹ تھا۔ کہ ہر اکسٹرا اس یونین
کو اپنی یونین سمجھے اس کا ممبر سمجھے اپنے آپ کو۔ کیونکہ وہ یونین
ایکسٹراز کے فلمسازوں سے حقوق منوانے اور ان کی چیرہ دستیوں سے
بچانے کے لئے وجود میں آئی تھی۔

دادا آئے دن ایکسٹرا لڑکے اور لڑکیوں کو ورغلا پھسلا
کر جھوٹی سچی باتیں گھڑ کر فلمسازوں کے خلاف ہڑتالیں اور
بائیکاٹ کراتا رہتا تھا۔ اور جب ایسی کوئی سٹرائیک ہوتی تو
ایکسٹرا فلموں میں کام کرنا بند کر دیتے۔ جس سے فلمسازوں کو
شوٹنگ بند کرتے ہوئے اپنا نقصان کرنا پڑتا۔ اور وہ دادا
کو بلا کر ان کی منت سماجت کرتے کہ ہم ایکسٹرا لڑکے لڑکیوں
کے جائز مطالبات مان لیتے ہیں تم بھی مان جاؤ۔ سٹرائیک بند
کراؤ جلدی سے۔ ہمارا اور ایکسٹرا لڑکے لڑکیوں کا سمجھوتہ
کرادو۔ اور دادا کی ایسے موقعوں پر چاندی ہی چاندی ہوتی وہ
سمجھوتہ کرانے کے فلمسازوں سے دام وصول کرتا۔

سینکڑوں نوجوان اور فلمی شہرت حاصل کرنے کے شوقین
لڑکے لڑکیوں کا وہ دادا ہی بنکر دادا تھا۔ جن سے وہ خوش
ہوتا۔ ان کو مہینہ میں تین چار سو روپے تک کی آمدنی ہو جاتی

اور جن سے ناراض ہوتا ان کو دوسرے ایکسٹرا سپلائر بھی کام دیتے ہوئے گھبراتے تھے۔

دادا کی شکل وصورت بڑی وحشت ناک تھی۔ گہرا سانولا رنگ چہرے سے چالیس سالہ عیاشی کی زندگی کے نمایاں نقوش۔ سر گنجا اور وہاں دھدر کا نشان۔ جس میں سے کبھی کبھی پیلا پیلا پانی بھی رسنے لگتا تھا۔ چہرے پر کئی زخموں کے نشان۔ دایاں کان بھی کٹا ہوا۔

مشہور تھا۔ دادا کا جوانی کے زمانے میں فارس روڈ کی کسی رنڈی کے کوٹھے پر کسی دوسرے موالی سے جھگڑا ہو گیا تھا دونوں طرف سے چاقو چلے دادا نے دوسرے موالی کی ناک کاٹ ڈالی تو موالی نے دادا کا کان کاٹ دیا۔ دادا ان زخموں کے نشان بڑے فخر سے دکھایا کرتا تھا۔ کہ دیکھنے والے کو معلوم ہو جائے وہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نشے کے لال لال ڈورے ہوتے تھے۔ اور منہ سے ٹھرے اور تاڑی کی بو آتی رہتی تھی۔

دادا اپنے آپ کو بمبئی کا محمد شاہ رنگیلا سمجھتا تھا۔ ہر رات کو ایک نئی عورت اس کے بستر پر ہوتی سنیکڑوں ایکسٹرا

لڑکیوں سے وہ اپنی مہربانیوں کی قیمت وصول کر چکا تھا داوا کا بستر گرم کئے بغیر کسی ایکسٹرا لڑکی کو فلم میں کام ملنا ناممکن ہی تھا۔

مشہور تھا۔ کہ ایک خوبرو لڑکی نے انکار کر دیا تو داوانے اس کے چہرے پر تیزاب چھڑک کر ڈائن بنا دیا۔ ایک اور لڑکی نے نہ صرف انکار کیا۔ بلکہ داوا کے چہرے پر تھوک دیا۔ تو داوا نے موقعہ پا کر رات کے اندھیرے میں اس کو قتل کر کے اس کی لاش گٹر میں بہادی

بمبئی میں اکثر لوگ قتل کر کے لاش کو گٹر میں گرا دیتے ہیں جن میں شہر کے نالوں کا پانی ہر وقت اتنا تیز بہتا رہتا ہے کہ لاش کو بہا کر اسی وقت سمندر میں لے جاتا ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ جس نے قتل کیا اور کون قتل ہو گیا۔

منگو داوا بڑے فخر سے کہا کرتا تھا۔ میں نے درجنوں ایکسٹرا لڑکیوں کو ہیروئن بنا دیا۔ درجنوں لڑکیوں کو ہیرو کا رول دلوا دیا۔ وہ ہر شخص سے بازاری باتیں کرنے کا عادی تھا۔ فلم انڈسٹری میں اسے اگرچہ چڑھتی تو ان لوگوں سے جو پورن بھگت بنتے تھے۔ یا ان لڑکیوں سے جو اپنے آپ

کو میرا بائی کہتی تھیں

نامور ایکٹروں اور ایکٹرلیسوں کا وہ ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ جب کبھی موقع ملتا وہ پڑھے لکھے ایکسٹرا لڑکوں کو مفت شراب پلاتا۔ اور آوارہ ایکسٹرا لڑکیوں سے اُن کی کنٹی نیوٹی ملاتا۔ اور یہ وہ اس لئے کرتا۔ کہ پڑھے لکھے لڑکے اس کا چرچا کریں۔ اس کا پراپیگنڈا۔

رمجو بنڈل کو دیکھتے ہی شنگو دادا جلدی سے سپاٹ کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"آؤ گورو دیو آؤ — آج تو جھونپڑی کے گھر نارائن آگیا"

اور رمجو بنڈل نے اسے چھٹتے ہی تین چار موٹی موٹی گالیاں دیں اس کی ماں بہن خوب پنی۔ مگر شنگو دادا ہاتھ جوڑے ہنستا رہا۔ بولا

"تم جو جی آئے کہو گورو دیو — اور جو کوئی میری ماں بہن کا نام لے تو بوٹیاں کردوں۔ کہو کچھ لین سودا۔"

"ارے نا ہیں نا ہیں — سودا ووڈا کچھ نا ہیں۔ اپن تم کو ایک بات بولتا۔"

"کیا بات گورو جی —"

"یہ بابو اپن کا فرینڈ۔"

"بس پھر اپن کا بھی فرینڈ"

"بابو فلم میں کام کریں گا۔

"ضرور کرائیں گا۔ بابو کو ہیرو بنائیں گا۔ آہا۔

"بڑا سندر بابو۔"

"پکی بات۔"

"ہاں دادا پکی۔"

"کب چلائیں گا بابو کو پکچر میں۔"

"آجکل دادا بر کھارت ہے۔ سب سٹوڈیو بند پڑے ہیں کام نہیں ہو رہا۔ اگلے مہینے کام چالو ہو گا۔ میں سیٹھ وٹھل بھائی سے بات کروں گا۔"

"ضرور۔!"

"ضرور۔!"

"پکا پرامس۔"

"ہاں دادا پکا۔"

"اپن بولتا۔ تم یہ کام ناہیں کرے گا تو اپن تمہارا اوجھری پھٹ کرے گا۔

"اور اپن سیٹھ کی ڈھجری ٹیٹ کر دے گا۔ جو سالا بابو کو کام نہ دے گا۔"

منگو دادا نے مجھے ہیرو بنانے کا پکا وعدہ کیا تھا میں بہت خوش تھا کہ اب مجھے ضرور چانس ملے گا۔ اس کے بعد منگو دادا نے ہماری نوعیت کی تاڑی۔ شراب، سگریٹ لیمن سوڈا اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں۔

اوپن کلوز
مہالکشمی روڈ
بمبئی کا مانٹی کارلو

"بولو سیٹھ لگاؤ گے؟" ایک جوتشی نے کہا
"لگاؤں گا۔" سیٹھ بولا
"کیا لگاؤ گے؟" جوتشی نے پوچھا
"تیئے سے پانچا۔" سیٹھ نے جواب دیا۔
"نہیں پانچے سے تیا۔" جوتشی نے کہا۔
"پکی بات۔"
"پتھر پر لکیر سمجھو۔"

صبح سے لے کر شام تک مہالکشمی روڈ پر تو خاص کر ایسی باتیں کثرت سننے میں آرہی تھیں یہاں ایک بہت بڑی بلڈنگ ہے۔ جس کے باہر ہر وقت بیکڑوں کاریں کھڑی رہتی ہیں۔ اس بلڈنگ میں سٹہ مارکیٹ ہے۔ سیٹھ اور ساہوکار لوگ سٹہ کھیلنے آتے ہیں۔ جہاں اوپن ٹو کلوز لگایا جاسکتا ہے۔

اوپن لگایا جاسکتا ہے۔

کلوز لگایا جاسکتا ہے

بمبئی کی تین چوتھائی آبادی سٹہ کھیلتی ہے، نیویارک کاٹن مارکیٹ کے بھاؤ۔

شام کو جب بھاؤ کھلتا ہے۔ کئی سیٹھوں کی قسمت کھل جاتی ہے۔ اور کئی سیٹھوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے ٹیلی فون پر نیویارک سے آواز آنے تک لاکھوں پتی ہزاروں سیٹھ جو سٹہ کھیلتے ہیں۔ ٹیلیفون کے پاس بیٹھے ریسیور کان سے لگائے آواز کا انتظار کرتے ہیں۔

ایک منٹ میں کوئی لاکھوں روپے جیت جاتا ہے۔ کوئی ہار جاتا ہے۔ کئی لاکھوں پتی سیٹھ بس ایک جادوگر ملے

میں لاکھوں پتی سے بھکاری بن جاتے ہیں۔ اور کئی بھکاری سیٹھ پھر سے لاکھوں پتی ہو جاتے ہیں۔

نہ صرف سیٹھ اور ساہوکار۔ بلکہ عام لوگ بھی سٹے کھیلتے ہیں نمبر لگاتے ہیں - ہارتے ہیں جیتتے ہیں۔ رات دن نمبروں کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہیں۔ سٹے میں اگر شہنشاہی ہے۔ تو گداگری بھی ہے۔ جس کے زیادہ ہی امکانات ہیں۔

رمجو بنڈل اس دن مجھے اپنے ساتھ مہالکشمی روڈ پر سٹہ مارکیٹ میں لے گیا۔ عالیشان بلڈنگ کے باہر سینکڑوں موٹریں کھڑی تھیں۔ سٹے باز سیٹھوں اور ساہوکاروں کا اندر باہر ہجوم ہو رہا تھا۔ اس بلڈنگ کے اندر ایک مرمری تالاب ہے۔ جس کے چاروں طرف بر دگر اور منیم لوگ بیٹھے پوتھیوں پر سٹہ لگانے والوں کے نمبر اور رقم لکھتے رہتے ہیں۔ لگانے والے مختلف نمبروں پر ہزاروں لاکھوں کروڑوں۔ روپے لگاتے ہیں۔ سٹہ مارکیٹ کے بھاؤ چڑھتے گرتے رہتے ہیں۔

کبھی تیزی کبھی مندی۔

اوپن کلوز۔ کھل جا سم سم

رمجو منڈل نے سٹہ مارکیٹ کا دوسرا نام کھل جا سم سم رکھا ہوا تھا۔ وہ اکثر یہاں پاکٹ ماری کی وارداتیں کیا کرتا تھا۔ تالاب کے کنارے پر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔

" دیکھو بابو۔۔۔ اب تم اپن سے الگ ہو جاؤ۔ اپن جو پکڑا جائے تو تم اپن کو چھڑانے کی کوشش نہ کرنا"

اور وہ مجھے ایک جگہ ٹھہرا کر چلا گیا۔ میں وہاں چپ چاپ کھڑا سٹے بازوں کی شکلیں دیکھتا رہا کہ کیا کیا رنگ بدلتی ہیں۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا کہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

اوپن کلوز ——— تیزی مندی ——— تیئے سے پانچا پانچے سے تیا۔۔۔"

یہ میرے لئے بالکل اجنبی الفاظ تھے۔

اور پھر جب نیویارک کاٹن مارکیٹ سے آواز آئی بند کھلا۔ اوپن سے کلوز۔ ہوا تو کئی لوگ اوپن سے کلوز ہو گئے۔ کالا گارولی مچ گئی۔ دھکا پیل ہونے لگی

تو رجو بنڈل نے نہ جانے کس جیب پر بلیڈ چلا کر چلتا بنا میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے بلڈنگ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پارکٹ مار کر پورا پانچ ہزار روپیہ نکال لیا تھا کس کا اس نے۔

اب وہ ایک دن کا سلطان تھا۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے رجو بنڈل نے ڈرائیور کو فارس روڈ پر چلنے کو کہا تھا۔ ایک رنڈی کے ساتھ اس کو پیار تھا۔ وہ اس کا گانا سننا چاہتا تھا۔

فراٹے بھرتی ہوئی ٹیکسی ایک ایسی سڑک سے گزری جو رات کے ابتدائی حصے ہی میں سنسان پڑی تھی۔ کہیں اندھیرا کہیں اجالا۔ ایک جگہ بس اسٹینڈ پر چار اینگلو انڈین لڑکیاں کھڑی تھیں اور دو اینگلو انڈین لڑکیاں جنگ کے زمانے میں باہر سے آئے ہوئے غیر ملکی دو سپاہیوں کے ساتھ بس اسٹینڈ کے عقب میں کھڑی تھیں اور شاید ٹیپ ڈانس کر رہی تھیں۔

ڈکن کوئین

میں

سیفٹی ریزر

ڈکن کوئین ایک ایسی تیز رفتار گاڑی تھی جو چالیس پینتالیس منٹ میں پونا پہنچا دیتی تھی۔ اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے ڈکن کوئین کہا جاتا تھا جو پونا سے ہوتی ہوئی حیدرآباد دکن پہنچتی تھی۔ اکثر و بیشتر فلم اسٹار چونکہ پونا ٹراف ریس کھیلنے جاتے تھے اس لئے ریس والے دن تو اس گاڑی میں بڑا رش ہوتا تھا۔ اچکوں، اٹھائی گیروں، پاکٹ ماروں اور جوتشیوں کا میلہ۔ بمبئی سے پونا تک کئی پاکٹیں کٹ جاتیں۔ اس گاڑی میں ایک ہمیں کئی پاکٹ مار پاکٹ زنی کرتے تھے۔ لیکن ہر

مار رجو، بنڈل کو جب وہ کوئی پاکٹ مارتا تھا پتی دیتا تھا۔

رجو بنڈل پونا کا بڑا بدنام موالی اور پاکٹ مار تھا۔ ایسے ویسے لوگوں کا گورو گھنٹال۔ پولیس نے اُسے علاقہ بدر کر کے پونا سے بمبئی میں علاقہ بند کر دیا ہوا تھا۔ لیکن وہ ریس کے دنوں میں چھپ چھپا کر پونا پہنچ جاتا اور ریس کورس میں بڑی گڑ بڑ کرتا۔

بمبئی کے ہر فلم اسٹار کو سوائے چند فلم اسٹاروں کے ریس کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ شوق ان کا پاگل پن کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ وہ ریس کو فیشن سمجھتے تھے۔ وہ اداکار جو ریس نہیں کھیلتا تھا ان کے نزدیک اداکار ہی نہیں۔ فلم اسٹار ہی نہیں تھا۔

فلم اسٹاروں کو اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے بمبئی اور پونا میں جوتشی بہت ہیں۔ کیونکہ نہ صرف فلم اسٹار بلکہ سیٹھ اور ساہوکار بھی اپنے کاروبار میں کسی جوتشی سے پرسن لگائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ ہر سیٹھ ساہوکار اور فلم اسٹار کسی نہ کسی جوتشی سے رجوع کرتا ہے۔ کہ یہ دن، یہ ہفتہ، یہ سال اس کے لئے کیسا ہے۔ اور جوتشی اس کو پرسن لگا کر بتاتا ہے۔

بس رجو بنڈل کو اکثر یہ سمجھتا رہتا تھا کہ وہ یہ بُرا دھندا چھوڑ دے اور منگو دادا کی طرح کوئی فلمی چکر چلائے۔ اور رجو بنڈل نے میرے

ساتھ وعدہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اس کی پونا ڈربی کی لاٹری نکل آئی تو اس کو پانچ لاکھ روپیہ مل جائے گا۔ اور وہ فلم پروڈیوسر بن جائے گا۔ رجو بنڈل نے پونا ڈربی لاٹری کا دس روپے والا ٹکٹ خریدا ہوا تھا۔ اور یہ لاٹری نکلنے میں ابھی آٹھ مہینے باقی تھے۔ اس لاٹری کے ٹکٹ نہ صرف پونا اور بمبئی میں بلکہ سارے ہندوستان میں ایک سال پہلے ہی فروخت ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ لاکھوں لوگ یہ ٹکٹ خرید کر قسمت آزمائی کرتے تھے۔ اور یہ لاٹری کیا تھی؟

گھوڑوں کی ریس۔ اس ریس میں ہر سال پندرہ گھوڑے دوڑتے تھے۔ اس دوڑ میں اول آنے والے گھوڑے کے نمبر پہ پانچ لاکھ روپیہ ملتا تھا۔ دوئم آنے والے گھوڑے کے نمبر پہ ایک لاکھ روپیہ اور سوئم آنے والے گھوڑے کے لکی نمبر پہ پچاس ہزار۔

رجو دادا مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا۔

"دیکھو یوسف باپو۔ اپن نے گاڈ کو بول دیا ہے۔
او گاڈ اپن کا پہلا نمبر نکال دو۔ اپن پرامس کرتا
مانگتا کہ لائف میں پھر کبھی مجرا دھندا نہیں کرے
گا۔ اپن شینٹی فلیٹی اکھا چھوڑ دے گا۔"

اور میں دل میں رجو کے لئے دعائیں مانگا کرتا تھا۔

"اے خدا۔ تیرا یہ بندہ نیک ہونا چاہتا ہے۔
یہ بُرا دھندا چھوڑنا چاہتا ہے۔ نیکی کی خاطر،
بھلائی کی خاطر اس کا نمبر نکال دو۔ تاکہ یہ نیک بن جائے
اس بُرے دھندے کو چھوڑ دے۔ خداوند! رجو
کو لاٹری سے پانچ لاکھ روپیہ دلوا دینا تیرے آگے
تو کوئی بات ہی نہیں۔"

لکی نمبر سیون — رجو دادا کے ٹکٹ کا نمبر سیون تھا۔ اور دادا نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لکی نمبر سیون۔ تاڑی پی کر وہ اپنے ٹکٹ کو چوما کرتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ بڑا اچھا شگون تھا۔

اُس دن میں اور رجو دادا پونا جا رہے تھے ریس دیکھنے۔ مجھے تو گھوڑ دوڑ سے زیادہ فلمی پریوں کے جمگھٹے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جب گھوڑے دوڑتے ہیں تو فلمی پریاں کیا کرتی ہیں۔ فلمی گلفام کیا کرتے۔ جب وہ جیت جاتے ہیں۔ جب وہ ہار جاتے ہیں۔ تو وہ کیا کرتے ہیں۔

دکن کوئین خراٹے بھرتی پونا کو چلی جا رہی تھی۔ اور اس کے ڈبوں کے اندر سیفٹی ریزر چل رہے تھے۔ پاکٹ مار پاکٹیں مار کر رجو دادا کو پیچ دے رہے تھے۔ اور جب گاڑی پونا پہنچی رجو

دادا کی جیب نوٹوں سے ابھر کر یہاں پہنچ چکی تھی۔

اور پھر دادا نے ایک ایسا کام کر دکھایا کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ پونا اسٹیشن پر ایک مصیبت کی ماری غریب لڑکی اپنے باپ کی لاش رکھے ہوئے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی اس کا ہارٹ فیل ہو گیا اور وہ مر گیا۔ لڑکی کے پاس اس کے کفن دفن اور اس کی لاش کو اپنے ٹھکانے تک پہنچانے کے لیئے پیسے نہ تھے۔ وہ اپنی چادر زمین پر بچھائے لوگوں سے چندہ مانگ رہی تھی۔ لیکن وہاں دان کرنے والے بہت کم نظر آ رہے تھے راہگیروں میں۔ چادر بچھائے لڑکی کو دو گھنٹے ہو چکے تھے لیکن پیسے اتنے اکٹھے ہوئے تھے کہ ابھی روپیہ بھی پورا نہ ہوا تھا۔

رجو دادا نے دیکھا تو وہیں رک گیا۔ تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا لاش کو دیکھتا رہا۔ اور پھر اس نے اپنی جیب میں ٹھنسے ہوئے نہ جانے کتنے نوٹ اس لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیئے اور چل پڑا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔

"کون کہتا ہے کہ موالی انسان نہیں ہوتے۔
ان کے دل میں انسانیت کا درد نہیں ہوتا۔
کون کہتا ہے کہ ان کی زندگی کے اندھیرے
میں روشنی کی کرن نہیں پھوٹ سکتی۔ زندگی

میں کوئی حادثہ، کوئی واقعہ کسی وقت
بھی ان کے ذہن کو بدل سکتا ہے۔
ان سے نفرت کرنے کی بجائے ان
کو پیار سے زندگی کے روشن راستوں
کا پتہ دیتے رہنا چاہیے۔ کوئی لمحہ کوئی
بات کسی وقت بھی ان کی کایا پلٹ
سکتی ہے۔"

لکی نمبر بارہ ——— رابن ہڈ ——— یہ اس گھوڑے کا نمبر اور نام تھا۔ جو اس دن پونا ٹرف پر تیسری دوڑ میں دوڑ رہا تھا۔ اور اس کا بڑا چرچا تھا۔ فلم اسٹار کا پسندیدہ گھوڑا۔ کیا ایکٹر کیا ایکٹریسیں سبھی اس وقت رابن ہڈ پر ہیوی اسٹیک کر رہے تھے۔ کیمرے اور دوربینیں لئے فلمی پریاں اور گلفام ادھر ادھر ٹپ ٹپ کرتے پھر رہے تھے۔ اور دادا جو دادا اس وقت اپنی پھرکیاں چلا رہا تھا۔ وہ کسی بھاری پرس کسی بھاری بٹوے کی تاک جھانک میں تھا۔

ریس کورس کے نامور اور ہر دلعزیز جوتشی پنڈت سورج گرہن چاند گرہن جی پرسی پرپرسن لگا رہے تھے سادہ

سب کو یہی تیار رہے تھے کہ رابن ہڈ دوڑ جیتے گا۔ جی بھر کر آنکھیں بند کر کے لگاؤ اس پر جو کچھ لگانا ہے۔ اس وقت شکر ستارہ میکھ اور کنبھ راسس میں ہے۔ رابن ہڈ جیتے ہی جیتے۔ کیونکہ رابن ہڈ کا نمبر تھا بارہ اور کنبھ راسی کے بھی بارہ نکھشتر تھے۔

پوم پوم ——— رابن ہڈ ——— لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہو رہا تھا۔ دوڑ شروع ہو رہی تھی۔

پوم پوم ——— رابن ہڈ ——— سور کنگ ——— راجکمار دیا دن گڑھ کا نامور گھوڑا جھانسی کی رانی ——— ہماچل ——— کا دیری ——— گوداوری ——— اس دوڑ میں سات گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ پر رابن ہڈ کی بڑی دھوم مچی تھی۔

گھوڑ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ پسٹل کے ہوائی فائر پر گھوڑے چھوٹے۔ ان پر بیٹھے ہوئے بنے سنورے چالاک و چرکس جاکی گھوڑوں کی لگامیں تھامے ان کی پیٹھ پر جھکے ہوئے تھے۔ گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ سب سے پہلے کاویری آگے بڑھ گیا۔ ایک فرلانگ

——— دو فرلانگ ——— تیسرے فرلانگ پر اُسے ہماچل نے آلیا۔ کاویری سے آگے نکل گیا۔ گو واوری اس وقت تیسرے نمبر اور پوم پوم چوتھے نمبر پر تھا۔ ان سے پیچھے سلور کنگ تھا۔ اور اس کے پیچھے رابن ہڈ۔ جو بھاگ رہا تھا اور ساتھ ساتھ لید رہا تھا۔ اور فلمی پریوں فلمی گلفاموں کے دل سیتے ہیں تیز تیز دھڑک رہے تھے وہ دوربینیں آنکھوں سے لگائے ٹرف کے جنگلے پر جھکے ہوئے تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ رابن ہڈ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ لیکن وہ تو لید لاد کر جیسے اڑن کھٹولا بن گیا۔ ایک دم ہنہنایا اور تیر کی طرح نکلا۔ اور سب گھوڑوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا سب سے آگے نکل گیا۔

ہاہاہا ——— !!!

ہوہوہو۔ ——— !!!

تالیاں — سیٹیاں — شور و شغب —

رابن ہڈ ون آیا تھا۔ ریس جیت گیا تھا۔ بھاؤ چڑھا ہوا تھا۔ پانچ سے پندرہ مل رہے تھے۔ وہ جنہوں نے رابن ہڈ پر لگایا ہوا تھا خوب کمایا انہوں نے۔ جیتنے والے بھیڑ بھاڑ میں ہنستے بجتے اُچھل اُچھل کر خوشی خوشی چلے تو رمجو دادا نے بھی اپنا

بلیڈ چلا دیا۔ ایک سیٹھ کی پاکٹ ماری تو پچیس ہزار نکال لیا۔ سیٹھ کا تو شاید کہیں دم نکل گیا ہوگا دولت جانے کے دھچکے سے ۔ اور رنجو دادا ریس سے نکل کر اسٹیشن پر۔ وہاں سے گاڑی میں سوار ہوا اور بمبئی کی طرف۔ جس ڈبے میں دادا بیٹھا تھا۔ اُس میں ایک سیٹھ بھی بیٹھا تھا۔ موٹا مرغا تھا۔ دادا نے اُسے بھی حلال کرنے کے لئے بلیڈ چلایا تو دادا کا اپنا ہی ہاتھ چل گیا۔ وار اوچھا پڑا۔ اتفاق کی بات ہے جو ایسا ہو گیا ورنہ دادا تو پاکٹ مارنے میں بڑا پاکٹ تھا۔ کپڑے کے ساتھ سیٹھ کی ذرا سی کھال بھی کٹ گئی تو اس نے شور مچا دیا۔ دادا نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا۔ زنجیر کھینچ کر گاڑی کو روکا گیا۔ گارڈ کے ڈبے کے ساتھ ہی پولیس ڈبی تھی۔ نیلی پگڑی والے دادا کو پکڑ کر لے گئے۔ مقدمہ چلا۔ دادا کو عدالت نے ایک سال قید بامشقت کی سزا دی۔ دادا جیل خانے چلا گیا۔ قید ہو گیا۔

نگار خانے

صنم خانے

رجو دادا کے قید ہو جانے پر میں نے سوچا اب منگو دادا کے پاس چلنا چاہیے۔ کیونکہ برکھا کا موسم ختم ہونے والا تھا اور نگار خانوں میں بارشوں کی وجہ سے رکی ہوئی فلموں کی پھر سے شوٹنگ کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔

میں ایکسٹرا یونین کے دفتر میں پہنچا تو منگو دادا اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ دفتر کا منشی گھوڑو رام دفتر میں اپنی مخصوص کرسی پر رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔

منشی گھوٹو رام پڑھا لکھا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ہنگو دادا چونکہ ان پڑھ جاہل تھا اس لئے اس نے دفتر کے کام کے لئے منشی گھوٹو رام کو تین سو روپے ماہوار پر ملازم رکھا ہوا تھا۔ ایکسٹرا یونین کا دفتری کام چلانے میں منشی گھوٹو رام کا بڑا ہاتھ تھا۔ جب میں آیا تھا منشی گھوٹو رام نے مجھے دیکھا تھا اور اچھی طرح پہچانتا تھا۔ بولا۔

"دادا ایک کام پر صبح سے گورے گاؤں
گیا ہوا ہے۔ بس آنے ہی والا ہے تم بابو
لوگ ہمارے پاس ادھر بیٹھو۔ بولو
کیا پئیں گا۔ لیمن ڈیمن یا چائے؟"

میں نے کہا ——————

"منشی جی اس وقت کسی چیز کی ضرورت نہیں۔
بڑی مہربانی ہے آپ کی"

ایکسٹرا یونین کا دفتر ایک دو منزلہ عمارت میں تھا۔ جسے ہنگو دادا نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ منشی جی کے کمرے میں ہوا رک جانے سے بڑا گھمس ہو رہا تھا۔ میں اُن سے کہہ کر کمرے کے باہر ٹہلنے لگا۔ بمبئی شہر میں سمندری ہوائیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ لیکن اگر گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے ہوا کبھی بند ہو جاتی ہے۔ تو

گنجان آباد ہونے کی وجہ سے سارے شہر میں اتنا گھمس ہو جاتا ہے کہ بس قیامت آ جاتی ہے۔ہر شخص کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

"نیا پٹاخہ - پوپٹ" سرگوشی میں یہ آواز اچانک میرے کان میں پڑی تو میں نے پچھلی طرف گھوم کر دیکھا-ایک نوجوان لونڈا ٹھوکا دے کر اپنے ساتھی لونڈے سے کہہ رہا تھا-جس نے گلے میں گھٹیا درجہ کا سرخ ریشمی رومال باندھا ہوا تھا اور کان کے اوپر ادھ جلی بیڑی رکھی ہوئی تھی-

"ہاں بڑی مجے دار لونڈیا ہے" اس کے ساتھی لڑکے نے جواب دیا-

"نیا پنچھی"

اور پہلے والے نوجوان لونڈے نے اپنے کان پر رکھی ادھ جلی بیڑی اپنے موٹے بھدے ہونٹوں میں دباتے ہوئے تیلی ماچس کی ڈبیہ کے گھسے ہوئے مصالحہ پر رگڑی تو تیلی کی نوک پر لگا ہوا مصالحہ جھڑ گیا-اُس نے ایک گندی گالی دی۔ جھنجھلا کر تیلی زمین پر پھینک دی - بولا-

"یہ سالی ماچس بھی اپن لوگ کی قسمت سا تک سیل گیلی -ذری اپنا لائٹر دینا"

"اس میں سالا پٹرول ناہیں۔ اپن سالا
اس کو کھولی میں ٹپک آیا۔"

وہ لونڈیا بھی تھوڑی دور کھڑی اُن دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔
وہ بہت دیر سے اکسٹرا سپلائر یونین کے دفتر کے سامنے کھڑی تھی۔
اتنے میں یونین کے چپڑاسی نے اُس سے پوچھا۔

"اکسٹرا میں بھرتی ہونے آئی ہو؟"

"ہاں" لڑکی نے دبی آواز میں کہا۔

"اندر دفتر میں چلو" چپڑاسی نے کہا۔ اور وہ جھجکتی ہوئی چپڑاسی کے ساتھ اندر آکر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ" چپڑاسی نے دیوار سے لگے بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سکتر صاحب کہاں ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"وہ گورے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ بس اب آتے ہی ہوں گے۔" چپڑاسی نے جواب دیا۔

"بھیّا مجھے پیاس لگی ہے" لڑکی نے کہا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

چپڑاسی نے اُسے گلاس میں پانی لاکر دیا۔ اور وہ پورا گلاس

چڑھا گئی۔ اتنے میں اکسٹرا یونین کا سکتر منگو دادا آگیا۔ تو کمرے میں اچھی خاصی بھیڑ ہوگئی۔ فلموں میں کام کرنے والے ایکسٹرا ایک کے اوپر ایک گرے پڑ رہے تھے۔ منگو دادا نے ان سب کو کمرے سے باہر نکال دیا اور لڑکی سے پوچھا۔

"کیا ہے۔ کیوں آئی ہوئی ہو؟"

"فلم میں کام کروں گی" لڑکی نے کہا۔

"پہلے کہیں کام کیا؟" منگو دادا نے پوچھا۔

"نہیں۔ کام نہیں بنا" لڑکی نے جواب دیا۔

"کام کیوں نہیں بنا؟" منگو دادا نے پوچھا۔

"میں نے دوسروں کا کام نہیں بنایا" لڑکی نے بے جھجک جواب دیا۔

"تمہارا نام"

"کامنا"

"کدھر رہتی ہو؟"

"ماہم میں — ایک سو آٹھ بھورا بلڈنگ کے دوسرے فلور میں"

"منشی جی" منگو دادا نے منشی گھوٹو رام کو آواز دی۔

"جی صاحب" منشی جی جھٹ سے بولے۔

"اس لونڈیا سے داخلہ کی فیس لو۔ اس کا نام رجسٹر میں لکھو"

دادا نے کہا۔

"اچھا صاحب" منشی گھوڑو رام نے کہا۔

اتنے میں منگو دادا کی نظر مجھ پر پڑی۔ بھاگ کر آیا۔ مجھ سے لپٹ گیا۔ بولا۔

"گورو دیو کال کوٹھڑی میں چلا گیا۔
اپن کو بڑا افسوس ہے۔ اور دیکھو
اپن تم کو اِدھر بڑا یاد کرتا پڑا بابو۔
اِدھر سب جگہ فلمی کام چالو ہو گیا
اپن نے سیٹھ وٹھل بھائی سے بولا۔
سیٹھ تم کو دیکھنا مانگتا"

"میں تیار ہوں۔ جب جی چاہے چلو دادا" میں نے کہا۔

"ابھی چلے گا۔ پہلے اپن ادھر تھوڑا سا کام کرے گا۔ اور بابو تم اب کس کے پاس رہتا؟" دادا نے پوچھا۔

"جب سے دادا قید ہوا کھولی بند
پڑا ہے۔ اپن سالا اِدھر اُدھر

مارا مارا پھرتا بمبئی شہر میں فٹ پاتھ
پر سوتا۔"
"ناہیں — ناہیں — اکھا بنڈل بات۔
تم سالا بابو اب اپن کے پاس رہے
گا۔ اپن سالا تم کو ہیرو بنائیں گا۔
تم بڑا سُندر بابو۔ بانکا بابو" دادا
نے کہا۔ اور ایک کام میں لگ
گیا۔

میں گھمس کی وجہ سے پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اب وہ اکسٹرا لڑکی یونین کے دفتر سے باہر نکل آئی تھی۔ اور اُسے پانچ دوسری ایکسٹرا لونڈیوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ بھی یونین کے دفتر سے باہر نکلی تھیں۔ اور یونین کی پرانی ممبر تھیں۔

"تمہیں اپنے گھر جانے کی جلدی تو نہیں"۔ ایک پرانی اکسٹرا لونڈیا نے نئی ایکسٹرا لونڈیا سے پوچھا۔

"کوئی خاص جلدی نہیں"۔ نئی لڑکی نے کہا۔

"پھر تم ہمارے ساتھ ادھر آؤ۔ آؤ۔ آج ہمیں بھی شوٹنگ

پر نہیں جانا ۔ چلو اِدھر کنٹین میں چل کر بیٹھیں۔
کھانا کھائیں گے ۔ اور پھر مٹنی شو دیکھیں گے"

اور وہ سب کنٹین میں چلی آئیں ۔ میں بھی ان کی باتیں ۔ سننے کے
لئے کنٹین میں چلا آیا ۔ اور ان کی باتیں سننے لگا۔

وہ قصہ چہار درویش کے درویشوں کی طرح چائے پیتے ہوئے
باتیں کر رہی تھیں ۔ ایک پرانی ایکسٹرا لونڈیا اپنی زندگی کا قصہ سنا
رہی تھی۔

"میرے پتا جی ۔ ویلڈنگ کے کارخانے میں
کام کرتے تھے ۔ لوہے میں سوراخ کرتے
ہوئے گیس کا چمکارا پڑا تو ان کی آنکھیں
خراب ہو گئیں ۔ وہ اندھے ہو گئے ۔ چھ
سال سے میری ماتا جی محنت مزدوری کرکے
ہم پانچ بہنوں کو پال رہی ہیں ۔ ابھی کوئی
چھ مہینہ سے میں نے مجبور ہو کر فلموں میں ایکسٹرا
کام کرنے کا دھندا شروع کیا ہے ۔ مہینہ میں
آٹھ دس میک اپ ہو جاتے ہیں ۔"

"تم کو فلموں میں کام کرکے کتنا مل جاتا ہے؟

نئی ایکسٹرا لڑکی نے پوچھا۔

"بڑی مشکل سے روٹی پوری ہوتی ہے"

پہلی پرانی ایکسٹرا نے جواب دیا۔

اتنے میں فلم "باورے نین" کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر گرجو ناتھن اُدھر آ نکلا تو پرانی ایکسٹرا لڑکیوں نے نئی ایکسٹرا لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"گرجو صاحب دیکھو کیسی اچھی لونڈیا ہے۔ اپنے صاحب کو بولو اس کو فلم میں کام دے"

"دیکھا گرجو صاحب تمہاری سب ہیروئنوں سے اچھی" دوسری لڑکی نے کہا۔

"تم نے ایکسٹرا اسپلائر یونین میں اپنا نام رجسٹر کروا لیا ہے؟"

گرجو ناتھن نے نئی ایکسٹرا لڑکی سے پوچھا۔

"جی" نئی ایکسٹرا لڑکی نے مختصر سا جواب دیا۔

"نمبری کا کارڈ مل گیا تم کو؟" گرجو نے پوچھا۔

"جی" وہ اسی طرح نظریں نیچی کئے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"کام ملے گا تم کو" گرجو نے اُس کو خوشخبری سنائی۔

"ہم تمہارا نام سپیشل لسٹ میں لیں گے"

"شکریہ"

"تم ایک ڈائیلاگ بول لوگی نا؟"

"جی" اس نے اپنی گردن اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں ڈائیلاگ بول لوں گی"

"لیکن یہاں خالی ڈائیلاگ بولنے سے کام نہیں چلتا۔ یہاں کیمرے کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا" گرجو نے کہا۔

"اگر تم ذرا بھی جھجک گئیں تو چوپٹ"

"جی"

"ایکشن اور کیمرے کے سامنے فری ہونا بہت ضروری ہے۔ شرمانے ورمانے سے کام نہیں چلے گا" گرجو مسکرایا۔

"جی ——— !"

"کیا جی ——— ؟"

"شرمانے ورمانے سے کام نہیں چلے گا"

"لیکن تم تو یہیں شرم سے زمین میں گڑی جا رہی ہو"

"کیمرے کے سامنے ایسا نہیں ہوگا"

"بس پھر تم لاکھوں روپے کماؤ گی۔"

"اچھا جی۔"

"ایک اور بات۔"

"جی کیا بات؟"

"پہلے پہل تمہیں ریٹ و یٹ کے بارے میں جھگڑنا نہیں ہوگا۔"
گرجو نے کہا۔

"نہیں جھگڑوں گی۔" لڑکی نے کہا۔

"جو ہم لوگ دے دیں گے لے لوگی؟"

"جی ہاں۔"

"جو ہم لوگ کہیں گے کرو گی؟"

"آپ لوگ کیا کیا کہیں گے؟ وہ چونک کر بولی۔

"کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔" گرجو نے کہا۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔"

"کل تم ٹھیک صبح آٹھ بجے مہالکشمی سٹوڈیو میں آنا۔ میں تم کو ڈائرکٹر صاحب کے سامنے پیش کروں گا۔"

"میں آجاؤں گی۔"

"ٹھیک آٹھ بجے۔"

"سمجھ گئی"

اور پھر گرجو ناتھن نے ان پانچوں پرانی ایکسٹرا لڑکیوں سے کہا۔

"تم لوگوں کا نام بھی ہے لسٹ ہیں۔ تم پانچوں بھی آنا"

"ہم کو معلوم ہے" ان میں سے ایک بولی۔

"گوری ناتھ پروڈکشن انچارج ہم کو بتا گیا تھا" دوسری نے کہا۔

"دیکھو تمہاری چنڈال چوکڑی ریٹ کے معاملہ میں بڑا جھگڑا کرتی ہے"

"جو ریٹ ہے ہم وہی مانگتے ہیں"

"آج کل فلم کی حالت کا پتہ ہے تمہیں"

"سب پتہ ہے"

"پھر بھی تم لوگ جھگڑتی ہو"

"تم لوگ ہمارا گلہ جو کاٹتے ہو"

"ہم تم کو اے گریڈ کے پیسے دلاتے ہیں۔ اور کوئی تم لوگوں کو بی گریڈ کے پیسے بھی نہ دے"

اور پھر وہ گرجو ناتھن کے ساتھ کنٹین سے اٹھ کر چلی گئیں تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے کنٹین سے نکل آیا۔ تو مجھے منگو دادا کا خیال آیا کہ وہ اب تک کام سے فارغ ہو چکا ہوگا۔ میں ایکسٹرا یونین

کے دفتر میں آیا تو دادا کام سے فارغ ہو کر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"اے بانکے بابو تم کدھر چلا گیا تھا؟"

"کمرے میں گھمس ہے دادا۔ ہوا میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر۔"

"چلو اپن کے ساتھ سیٹھ وٹھل بھائی کے پاس چلو۔ اپن تمہارا کام آج بس ٹچن فٹ کر دے گا۔"

اور منگو دادا مجھے اندرا مووی ٹون کے مالک سیٹھ وٹھل بھائی کے دفتر میں لے گیا۔

○

اندر سبھا

اندرا موی ٹون کے مالک سیٹھ وٹھل بھائی کے کمرے میں اس وقت اندر سبھا لگی ہوئی تھی۔ فلمی پریاں۔ فلمی گلفام۔ اور سیٹھ جی راجہ اندر بنے اپنی نئی فلم ,, ننگی دھرتی " کے ڈائریکٹر نربدا نار ائن کی باتوں پر غور کر رہے تھے۔ یہ باتیں فلم ننگی دھرتی کی کہانی اور شوٹنگ پر ہو رہی تھیں۔ ڈائرکٹر نربدا نرائن کھانس کھنکار کر پھر بولا۔

,, فلم یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک بہت بڑا دربار ہے۔ اور ایک بڑا محل۔ تاج محل

سا۔ اس کے ساٹھ دروازے۔ ایک
سو ساٹھ کھڑکیاں اور دو سو ساٹھ ستون
اور چار سو ساٹھ فانوس۔"

"اتنا بڑا سیٹ" یہ سیٹھ وٹھل بھائی کی آواز تھی۔

"یکدم بہت بڑا سیٹ" ڈائرکٹر نربدا نارائن نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دربار میں آٹھ سو لڑکیاں ناچ رہی ہیں۔"

"آٹھ سو لڑکیاں" کمرے میں آجو باجو بیٹھے رائٹر لوگ خوشی سے چلائے اور ان کے ساتھ بیٹھی فلمی پریاں بھی خوش ہو گئیں۔ کیوں کہ ڈانس میں آٹھ لڑکیاں تھیں اور ان سب کو کام ملنا ضروری تھا۔

"آٹھ سو لڑکیاں دربار میں ناچ رہی ہیں" ڈائرکٹر نربدا نارائن پھر شروع ہو گیا۔

"یہ میری فلم کا اوپننگ شاٹ ہے۔ سمجھے
آٹھ سو لڑکیاں۔ سب ایک سیٹ پر ناچ
رہی ہیں۔ دو سو ٹیکنی کلر میں۔ دو سو گیوا
کلر میں۔ دو سو ڈی لکس کلر میں اور
دو سو ٹیٹ مین کلر میں۔"

"ارے ناہیں - ناہیں" سیٹھ ڈھل بھائی بیچ میں بول پڑا۔

"لیڈ مین کلر ناہیں چلے گا ایکفا کلر چلے گا"

"جی سیٹھ جی - ویری گڈ آئیڈیا" نربدا نارائن نے کہا۔ اور خفت مٹانے کے لئے فونٹین پن چبانے لگا۔

"اوپننگ کا آئیڈیا بہت اچھا ہے" ایک گیت کار بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے" یہ فلم ننگی دھرتی کی کہانی کے لکھاری منشی خنجر کی آواز تھی۔

"اوپننگ تو اچھا ہے - پر اس میں ہیرو سالا کہاں ہے؟" سیٹھ ڈھل بھائی نے پوچھا۔

"ہیرو سالا اوپننگ میں نہیں ہے" نربدا نارائن نے جلدی سے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ تو اس کی بغل میں بیٹھی ایک نمکین لونڈیا نے اپنی کرسی کی اوٹ سے وائٹ ہارس کی بوتل سے ایک پیگ سوڈے کے ساتھ گلاس میں ڈال کر نربدا نارائن کو پیش کیا تو اس نے ایک گھونٹ بھرا۔ تو ادھر سے سیٹھ ڈھل بھائی نے اسے ایک ڈانٹ پلائی۔

"گدھے کا بچہ - اوپننگ میں ہیرو نہیں آئیں گا - تو فلم بنڈل ہو جائیں گا" سیٹھ نے جیب سے سونے کی ڈبیہ نکال کر نسوار ناک

میں گٹر کی اور پھر گر جا۔

"اوپننگ میں تم جو ہیرو کو فلم کے
اندر نہیں نکالے گا تو اپن تم کو
سٹوڈیو سے نکال دے گا۔
بامبے سے نکال دے گا۔ انڈیا
سے نکال دے گا۔"

"تو اپن پھر کدھر جائیں گا سیٹھ جی؟" نربدا نارائن نے یتیموں کا سا منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم جائیں گا کالے پانی۔ تم جائیں گا بھاڑ میں۔" سیٹھ وٹھل بھائی نے کہا۔

تو سب نے قہقہہ لگایا۔ اور نربدا نارائن نے خفت مٹانے کے لئے ریشمی رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کوئی فکر کا بات نہیں سیٹھ۔ اب میں ہیرو کو اوپننگ میں نکالتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے فلم کے پٹار ے سے ہیرو کا جھرلو نکالنے لگا ہے۔

"نکالو۔ جلدی نکالو۔ نائیں تو اپن ابھی تمہارا کچومر نکالیں گا۔" سیٹھ وٹھل نے کہا۔

اور نربدا نارائن بولا۔

"دیکھئے۔ دربار کے اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔

دربار کے باہر ہیرو گھوڑا دوڑاتے آتا ہے"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" سیٹھ ڈھل بھائی خوش ہو کر بولا۔

"گھوڑا ایسے دوڑتا ہے۔ ٹپاٹپ۔ ٹپاٹپ۔ ٹپاٹپ"

"چھپا چھپ۔ چھپا چھپ۔ چھپا چھپ" یہ منشی خنجر کی آواز تھی۔

"گھپا گھپ۔ گھپا گھپ۔ گھپا گھپ" گیت کار نے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے" یہ منشی خنجر کی آواز تھی۔ اتنے میں نربدا نارائن اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور چلا کر کہنے لگا۔

"ہیرو گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتا ہے۔
اس کے ہاتھ میں ہنٹر ہے۔ سڑاک سے
گھوڑے کی پیٹھ پر لگاتا ہے۔ فٹاک
سے اس کی پیٹھ سے اُترتا ہے اور
کھٹاک سے دربار کا دروازہ کھول
کر اندر گھس جاتا ہے۔ دربان اس

کو ردکتا ہے تو ہیرو اس کو دھماک سے
ایک گھونسا لگاتا ہے۔"

"بہت خوب - بہت خوب" گیت کار جلدی سے چلایا کہ منشی خنجر کہانی کا لکھاری داد دینے میں پہل نہ کر جائے - لیکن منشی خنجر نے تو اس سے پہلے ہی سیٹھ جی کو سوال کا خنجر گھونپ دیا تھا۔

"کیوں سیٹھ جی کیسی کہانی لکھی ہے میں نے؟"

"یکدم اچھی کہانی - منشی جی تم کھوب سمجھتا کہانی وانی کو۔"

"شکریہ" منشی خنجر آداب بجا لاتے ہوئے بولا -

"سیٹھ جی ایک آئیڈیا میں بھی دوں" ایک اور کنڈم رائٹر بیچ میں بول پڑا -

"بولو بولو" سیٹھ ڈھل بھائی خوش ہو کر بولا -

"ہیرو گھوڑے سے نہیں اترے گا -
سڑاک سے ہنٹر مارے گا - فٹاک
سے گھوڑے کی پیٹھ پر اچھلے گا اور
دھماک سے دربار میں آجائے گا -
آگے آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کرتا ہوگا -
ہیرو ایک لڑکی کو اٹھائے گا - گھوڑے

کی پیٹھ پر ڈانس کرے گا۔ نیچے اس کا
گھوڑا بھی ڈانس کرے گا۔ اور لڑکی
ہیرو کی گود میں ڈانس کرنے لگے گا۔
وہ لڑکی سو بھنا سمرتھ ہو گا۔"

"ہی ہی ہی۔ کھی کھی کھی۔" سیٹھ وٹھل بھائی کے اِس بازو بیٹھی سو بھنا سمرتھ خوشی سے ہنسنے لگی۔

"ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ اپن بھی یہی سوچ رہا تھا۔" سیٹھ وٹھل بھائی نے کہا۔

"مگر وہ سالا ویلن کدھر سے آئیں گا؟"

"کدھر سے بھی آ سکتا۔" یہ نربدا نارائن کی آواز تھی۔

"ہال کے ساٹھ دروازے ہیں۔ وہ کدھر سے بھی آ سکتا ہے۔"

"ارے ناہیں ناہیں۔ ایسے ناہیں۔ اپن کو شارٹ سمجھاؤ۔ نہیں تو اپن تم کو بھی کلوروفارم سونگھاوے گا۔" سیٹھ وٹھل بھائی نے گرمی خشکی چھانٹتے ہوئے۔

"اچھا سیٹھ جی آپ کو ایک آئیڈیا بتاتا ہوں۔" نربدا نارائن نے کہا۔

"جلدی بتاؤ۔" سیٹھ نے کہا۔

"دربار میں آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کرتا ہے۔ ان میں گھوڑا ڈانس

کرتا ہے۔ گھوڑے پر ہیرو ڈانس کرتا ہے۔ اور ہیرو کی گود میں ہیروئن ڈانس کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آگے چلو۔"

"اتنے میں ایک پٹاخہ چھوٹتا ہے۔ چٹاخ سے روشن دان کا شیشہ ٹوٹتا ہے۔ اور ویلن سالا روشن دان سے اندر کودتا ہے۔ اور گھن گرج سے کہتا ہے۔ ہاؤ۔"

"ویری گریٹ آئیڈیا۔" سیٹھ خوش ہو کر بولا۔

"سُپرب آئیڈیا۔" سیٹھ کے سامنے بیٹھا ایک ڈسٹری بیوٹر بولا۔

"پکچر ہٹ جائے گی۔"

سیٹھ وٹھل بھائی کا دربار کافی دیر لگا رہا۔ اور پھر جب برخاست ہوا تو منگو دادا نے مجھے سیٹھ کے سامنے پیش کیا۔ تو سیٹھ نے سر سے پاؤں تک مجھ کو کئی بار بڑے غور سے دیکھا۔ بولا۔

"یکدم ہیرو نمبر ون۔ ویری فائن سکرین فیس۔"

"یہی تو میں نے بولا سیٹھ جی۔" اِدھر سے منگو دادا نے لقمہ دیا۔

"اس پکچر کے لئے سائن کر لو سیٹھ جی۔"

"ارے ناہیں دادا۔ اس پکچر میں ناہیں۔ اگلی پکچر میں۔ کاسیٹوم پکچر میں۔"

"چلو سیٹھ جی جیسے آپ کی مرضی۔" دادا نے کہا۔ اور پھر سیٹھ ڈھل بھائی مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"آج سے تم اِدھر کام کرے گا۔ اپن کا پروڈکشن انچارج سالا پھول شنکر بیمار ہے ہسپتال میں ہے۔ جب تک وہ اپنے کام پر نہیں آئیں گا تم اس کی جگہ کام کریں گا۔ اپن تم کو دو سو روپیہ پگار دے گا۔ اور جب تم اپن کی پکچر میں کام کرے گا تو تم کو پہلی پکچر میں ایک ہزار۔ دوسری میں دو ہزار اور تیسری میں تین ہزار پگار دے گا۔"

میں بہت خوش ہوا۔ بولا۔

"سیٹھ جی وہ پکچر کب شروع ہوگا؟"

"بڑی جلدی۔ یہ پکچر جب آدھی خلاص ہو جائیں گا۔" سیٹھ نے جواب دیا۔

میں اس دن سے اندرا مووی ٹون کا ملازم ہو گیا۔ میرے سپرد پروڈکشن کا کام کیا گیا تھا۔ رات کو دربار میں ناچ کی شوٹنگ ہو رہی

تھی بہت سی لڑکیوں کی ضرورت تھی ۔ ڈائرکٹر ز بدانا دائن کے کہنے پر مجھے ایکسٹرا لڑکیاں اکٹھی کرنا تھیں ۔ اس کے علاوہ اور کئی کام کرنے تھے ۔ پروڈکشن کا کام بڑا مشکل ہے ۔ اس میں کئی جھمیلے ہوتے ہیں ۔ نیا رنگروٹ ہونے کی وجہ سے کئی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں ۔ میں بڑا پریشان تھا ۔ اس موقعہ اسسٹنٹ پروڈکشن انچارج نرنجن نے میری بڑی مدد کی ۔ کئی باتیں مجھے ایسے طریقے سے سمجھائیں کہ فوراً میری سمجھ میں آ گئیں ۔ ڈانس کے لئے بہت سی لڑکیوں کی ضرورت تھی ۔ نرنجن سٹوڈیو کی گاڑی لے کر میرے ساتھ ہو لیا ۔

دادر مین روڈ پر سٹوڈیو کے قریب ایکسٹرا یونین کے دفتر کے سامنے ایک بدنام ایکسٹرا لڑکی سیمی بجلی کے کھمبے سے لگی اپنی سہیلی سلطانہ سے باتیں کر رہی تھی ۔ نرنجن کی نظر پڑی تو گاڑی روک لی ۔ دوڑ کر اس کے پاس پہنچا ۔ سیمی بڑا اچھا ناچتی تھی ۔ بولا ۔

"آج رات شوٹنگ ہے ۔ سیٹھ جی تمہیں بلاتے ہیں"

"جاؤ ۔ جاؤ ۔ تمہاری اور تمہارے سیٹھ کی ایسی تیسی" سیمی نے گرمی خشکی جھانٹتے ہوئے کہا ۔

"تمہارا سیٹھ تو بار بار بلا کر بھی کام نہیں دیتا ۔ میں نہیں جاؤں گی"۔

"آج تمہیں ضرور کام ملے گا سیمی" زرّین نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر میں ناچنے والی لڑکیوں کی ٹرائی ہو گی۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ رات کو شوٹنگ ہے۔ بہت سی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔"

سیمی تو شاید اب بھی انکار کر دیتی لیکن اس کی سہیلی سلطانہ نے اُسے سمجھایا۔

"چلو سیمی چلو۔ میں بھی چلتی ہوں۔ اُدھر سے اور لڑکیوں کو بھی لے لیتے ہیں۔"

اور نٹ کھٹ سیمی مسکرائی۔ سانولی گڑیا۔ کتابی چہرہ۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر نیچے حلقے پڑے ہوئے۔ ناک تیکھی مگر ہونٹ موٹے نچلے دانت ذرا ٹیڑھے میڑھے۔ قد نہ چھوٹا نہ لمبا۔ جسم بے حد متناسب۔ سینہ، کمر، کولہے، رانیں، پنڈلیاں منجھی ہوئیں۔

ہم نے ان دونوں لڑکیوں کو گاڑی میں بٹھایا اور ایکسٹرا یونین کے دفتر پہنچے۔ منگو دادا مجھے سیٹھ کے سپرد کر کے چلا آیا تھا مگر ابھی تک اپنے ٹھکانے پر نہیں پہنچا تھا۔ وہ شاید کسی دوسری

طرف نکل گیا تھا۔ میں نے منشی گھوٹو رام سے کہا۔
"منشی جی پروڈکشن انچارج ہو گیا ہوں۔"
"ارے چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ابھی تم یہاں سے گئے اور ابھی پروڈکشن انچارج بھی ہو گئے۔" منشی گھوٹو رام نے حیرت سے پوچھا۔
"اپنی اپنی قسمت ہے منشی جی۔" میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔ اب بابو تم بوندی کے لڈو کھلاؤ۔ اس خوشی میں۔"
"ضرور کھلاؤں گا۔ کل ایڈوانس ملے گا۔" میں نے کہا۔
گھوٹو رام بہت خوش ہوا۔ ایکسٹرا یونین کے دفتر میں اس وقت ایکسٹرا لڑکیوں کی پوری پلٹن بیٹھی تھی۔ ایک گاڑی تو ہمارے پاس تھی جو اتنی نفری کے لئے کافی نہ تھی۔ چار ٹیکسیاں کرائے پر لیں اور سب لڑکیوں کو اس میں ٹھوس ٹھاس کر سٹوڈیو کا راستہ لیا۔ یہ فلمی دنیا میں میرا پہلا دن تھا۔

○

فلمی باون گزے

اندرا موو ی ٹون کا مالک سیٹھ وٹھل بھائی اونچے قد کا آدمی تھا۔ موٹے جسم کا۔ سر کے بال بالکل سفید۔ گورا رنگ۔ ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں۔ جنگ کے زمانے میں فلموں کے لائسنس کی بلیک مارکیٹ کر رہا تھا۔ ان دنوں فلم کا ایک لائسنس کا بلیک میں لاکھ سوا لاکھ روپیہ منافع مل جاتا تھا۔

جنگ کی وجہ سے باہر سے خام مال نہیں آرہا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے کوٹہ مقرر کر دیا تھا جو اُن فلم پروڈیوسروں کو ملتا تھا جو

اس وقت تک کوئی کم سے کم پانچ فلمیں بنا چکے ہوں۔ اور سیٹھ وٹھل بھائی تو اس وقت تک کوئی بیس فلمیں بنا چکا تھا۔ جنگ سے پہلے ہر تین ماہ بعد ایک فلم تیار کر لیتا تھا۔ چار لائسنس تو اس کے پاس یونہی آ گئے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس تین سٹوڈیو تھے۔ چار چار فلموں کے لائسنس اور سٹوڈیوز کے حصے میں بھی آئے۔ بارہ لائسنس اگر سیٹھ چور بازار میں بیچتا تو ہر سال بیس لاکھ روپے کی مفت کی آمدنی تھی لیکن سیٹھ کو دولت کی پرواہ نہ تھی جو جو لوگ سٹوڈیوز میں کام کرتے تھے۔ سیٹھ ان کا اور ان کے بیوی بچوں کا پیٹ بھی پالنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ صرف چھ

لائسنس چور بازار میں بیچتا تھا۔ اور چھ کی فلمیں بناتا تھا۔ اور ان سے جو منافع ہوتا تھا اس سے جائداد خریدتے تھے۔ مکان، بڑی بڑی بلڈنگیں، ٹاٹا اور برلا کے فولادی کارخانوں کے حصے روئی کی مل کی ایجنسیاں۔ کھانڈ کی ملوں میں پارٹنر شپ۔ انہوں نے کئی جگہوں پر ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں۔ کالبا دیوی روڈ پر ان کی ایک شاندار کوٹھی تھی۔ جہاں انہوں نے ایک داشتہ رکھی ہوئی تھی۔ جس کا نام تھا کملہ میری۔

سیٹھ وٹھل بھائی اس وقت اپنی کیبن میں تھے اور فلاش کھیل رہے تھے۔ یکہ، دکی، تکی۔ یک رنگی رونند۔ پلائی وڈ اور

شیشے کا دروازہ اس کیبن کے اندر کھلتا تھا۔ اور بمبئی کی فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے ڈسٹری بیوٹر سیٹھ دمڑیئے کا انتظار کر رہے تھے۔

سیٹھ دمڑیہ۔ ناٹے اور موٹے قد کا ٹاٹھوں پتی سیٹھ۔ اوپر کا حصہ اگر اس کا ۲ دو من کا تھا تو نچلا حصہ اس کا پورے تین من کا۔ اتنے بڑے بڑے سائے کے وہ۔ سیٹھ کو سہارا دے کر چلانے کے لئے تین چار نوکر ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔

سیٹھ وِٹھل بھائی کے ساتھ فلاش کھیلنے والوں میں اُس وقت سیٹھ کے ساتھ اس کا نیا فلم ڈائرکٹر ورمن بھی تھا۔ جس کا دِل فلاش میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کچھ اداس اداس تھا۔ اس کا دل اس وقت تاش کے پتوں میں نہیں سیٹھ دمڑیئے میں لگا تھا۔ اور بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ سیٹھ وِٹھل بھائی نے ورمن سے وعدہ کیا تھا کہ سیٹھ دمڑیئے کے آتے ہی وہ اُسے دو ہزار روپے کا چیک دے گا۔ کیونکہ ڈائرکٹر اس کے لئے ایک نئی فلم شروع کر رہا تھا۔ ایک نئی کہانی۔ ایک نیا ڈائرکٹر۔ اس کہانی کا نام تھا ۔۔۔ "کالی گھٹا"

ورمن ایک ترقی یافتہ ذہن کا ڈائرکٹر تھا۔ وہ ماڈرن فلم تکنیک اور اداکاری کے بارے میں ہالی وڈ سے بہت کچھ سیکھ کر آیا تھا۔ وہ گھسی پٹی پرانی کہانیاں اور غیر فطری اداکاری کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ایسی زٹیل کہانیوں اور زٹیل اداکاری سے اُسے نفرت تھی۔ ایسے کہانی لکھنے والوں اور اداکاروں کو بھی وہ پسند نہ کرتا تھا۔ اور ایسی فلمیں بنانے والے اور دیکھنے والے تو اس کے نزدیک گھاس کھانے والے گدھے تھے۔ زٹیل لوگ زٹیل فلمیں۔

ہالی وڈ سے واپس آتے ہی اُسے دو چانس مل چکے تھے۔ اس نے دو فلمیں بنائی تھیں۔ دُکھیا بھارت اور دھرتی کے لال۔ دو فلمیں۔ جو ہندوستانی فلمی صنعت میں ہر لحاظ سے سنگ میل تھیں۔ لیکن فلاپ ہو گئی تھیں۔ فیل ہو گئی تھیں۔ گھاس کھانے والے گدھوں نے دونوں فلموں کو فیل کر دیا تھا۔

دکھیا بھارت اور دھرتی کے لال ایسی فلمیں گھاس کھانے والے گدھوں کی سمجھ میں نہ آ سکیں۔ جبکہ گھاس کھانے والے گدھوں نے مصنف ہدایت کار جال مستری کی تین فلموں کو بہت پسند کیا تھا۔ ان فلموں کا نام تھا۔

کنواری قینچی۔ پام بیچ۔ اور ایک پنجابی فلم۔ لچھیئے کنوا گدھے

ان تینوں فلموں میں سے ایک فلم نے سلور جوبلی دوسری نے گولڈن اور تیسری نے ہر شہر میں ڈائمنڈ جوبلی کی۔ گدھے تو بس گھاس ہی کھا سکتے ہیں۔ اور یہ فلمیں ان کے لئے ہری ہری گھاس تھیں۔ بڑا گراس کیا ان فلموں نے۔

جال مستری سالا بیک وقت کہانیاں بھی لکھتا تھا۔ گیت بھی لکھتا تھا اور ڈائرکشن بھی کرتا تھا۔ اُردو فلموں میں وہ اپنے آپ کو جہلکوی کالی داس اور پنجابی فلموں کی کہانیاں اور گانے لکھنے میں وہ اپنے آپ کو وارث شاہ سمجھتا تھا۔ لیکن اصل میں وہ گدھا تھا۔ وقت کی سفلہ پروری ہے کہ ایسے ایسے گدھے فن اور ادب کے خدا اور جبرل بنا دیئے جاتے ہیں۔

جال مستری کی تینوں فلمیں ہٹ گئیں تو ایک گدھے پروڈیوسر نے اُسی وقت دو فلموں کا اعلان کر دیا۔ سوہنی عرف کچا گھڑا۔ مہینوال عرف ہٹ کے بدھن۔ ان فلموں کا اعلان کرنے والا بھی گدھا تھا لیکن جال مستری سے چھوٹا گدھا۔ چھوٹا اس لئے کہ فلم پروڈیوسروں کو گھاس کھانے والے گدھوں کے لئے ایسی فلمیں ہی بنانی پڑتی ہیں۔ جو کہ گھاسلیٹ فلمیں ہوں۔ کیونکہ ایسی فلمیں گدھوں کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ اور فلم دیکھنے والے ایسی فلموں کے شائقین

گدھوں کی تعداد ہیضے اور طاعون کے جراثیم کی طرح زیادہ ہے پروڈیوسر ایسے گدھوں کی کھال کھینچ کر ہی اپنی کھال موٹی کر سکتے ہیں

شاید یہی وجہ تھی کہ سیٹھ وٹھل بھائی نے بھی ایک گھاسلیٹ پکچر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ جس کا نام تھا۔ ریت کے راہی عرف سسی پنوں عرف پنجابی رابن ہڈ عرف لاکڑا کاکڑا عرف کتے دا پتر عرف شرابی چوہا عرف فلمی وارث شاہ عرف لاہور کا کالی داس عرف پیار کی موت عرف چڑیے کی بیگم عرف اچھرہ موڑ عرف اصلی سلاجیت عرف نہلے تے دھیلا عرف نیلی سیاہی لال دوات عرف جادو کا ڈنڈا عرف بیڈرو بہادر عرف موت کا فرشتہ عرف ڈلا بھٹی عرف بارہ من کی دھوبن عرف گنجا بٹیرا۔

ایک فلم ایک ہزار نام۔ فلم نہیں بھول بھلیاں۔ جس میں پیار کا جنازہ، فن کا جنازہ، اداکاری کا جنازہ، اچھی کہانیوں کا جنازہ، اچھی کہانیاں لکھنے والوں کا جنازہ نکلنا تھا۔ اور بس ٹھیک تھا گھاسلیٹ پکچریں بنانے والے سیٹھ، ان کی کہانیاں لکھنے والے نقلی وارث شاہ اور کالی داس اور ایسی فلمیں دیکھنے والے گدھے جبھی زندہ رہ سکتے۔

سیٹھ وٹھل بھائی کی اس فلم کے کئی نام تھے جن میں سے صرف

ایک نام نکالا تھا فلم باہر نکالنے کے لئے اور مناسب بھی یہی تھا کہ فلم کا ڈائرکٹر صرف ایک تھا۔ اور وہ تھا جال مستری۔ اٹ دا گولا عرف چیں باگھا عرف ٹھرے دی خالی بوتل۔

عظیم فن کار کی عظیم تخلیق۔ ٹھرے کی خالی بوتل کا شاہکار۔ گھاسلیٹ فلمی ہیضہ۔ فلمی تپ دق۔

ریت کے راہی — جال مستری کی نئی فلم کا یہی نام تھا۔ پروڈیوسر سیٹھ وٹھل بھائی۔ فلمی دنیا کا ایٹم بم۔ گھاس کا سمندر۔ گھاسلیٹ فلموں کا انڈیا میں سب سے بڑا گودام۔

جال مستری اپنی فلموں میں عورت کے جسم کی نمائش کا بڑا شوقین تھا۔ عورت کے بال، عورت کی آنکھیں، عورت کا سینہ، عورت کی ٹانگیں، عورت کی رانیں اور پنڈلیاں، عورت کے کولہے، عورت کی کمر، اور ایسی پتلی اور باریک کمر کہ دیکھنے والے کو یہی معلوم ہو کہ اس عورت کی کمر تو ہے ہی نہیں۔ اور اگر ہے تو نہ جانے کہاں ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ عورت کو ننگا کر کے فلم میں لے آتا۔

"کیا کروں سیٹھ جی" جال مستری نے پتے اٹھا کر روند لگاتے ہوئے کہا۔

"سنسر کی قینچی سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ ایسی پکچر بناؤں کہ سارے ہندوستان کو پاگل بنا دوں۔ ایسی پکچر بناؤں کہ قیامت تک نہ اترے دیکھنے والوں کی گردنیں اتر جائیں۔ بدن کے کپڑے اتر جائیں۔ ان کی زندگی کی آگرہ میل پٹڑی سے اتر جائے۔ ایسی پکچر بناؤں کہ دیکھنے والوں کو بالکل گدھا بنا دوں۔ ایسی پکچر بناؤں جسے دیکھ کر ہر شریف عورت رنڈی بن جائے۔ ایسی پکچر بناؤں کہ بھلے مانس شوہروں کو بھڑوا بنا دوں۔ ایسی پکچر بناؤں کہ ہر محلے میں ایک خفیہ چکلہ بن جائے۔ ایسی پکچر بناؤں کہ ہر جوان کو چور، ڈاکو، راہزن اور رابن ہڈ بنا دوں۔ بغدادی چور بنا دوں۔ ایسی پکچر بناؤں کہ بمبئی کو پیرس بنا دوں۔ ایسی پکچر بناؤں سیٹھ کہ ہم تم دونوں پدم پتی بن جائیں۔"

"پھر بناتے کیوں نہیں ایسی پکچر"۔ سیٹھ ڈھل بھائی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"سنسر سے اپن نپٹ لیں گا۔ سنسر کے پاس
لوہے کی قینچی ہے۔ اپن کے پاس سونے
کی قینچی ہے۔ دولت کی قینچی ہے۔ اپن کی
قینچی بڑی تیز چلتی ہے۔ اور سنسر کی قینچی

فلمیں کاٹتے کاٹتے کھنڈی ہو گئی ہے۔
اپن کے پاس سونے چاندی کا کلوروفارم
ہے۔ سنسر کو سونگا کر بیہوش کر دیں
گا۔ اس کا پوسٹ مارٹم کر دیں گا۔ تمہاری
پکچر کا پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دیں گا۔"

اور جال مستری خوشی سے کرسی پر سے اچھل گیا۔ بولا۔

"بس تو سیٹھ جی آج ہی اعلان کر
دو۔ اپن کی نئی پکچر کا نام ہوگا فلمی
کوک شاستر عرف فرنچ لیدر۔"

"واہ ۔ واہ ۔ ویری گڈ ۔ ویری نائس۔" سیٹھ ڈھل بھائی کو یہ نام بڑا پسند آیا تھا اور صوفے پر سے اچھل کر میز پر آ گیا تھا اور اب وہاں سے اچھل کر جال مستری کے منتک پر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اکھا شوندر پکچر۔ اپن اس پر دو کروڑ روپیہ
لگانے کو بلکدم تیار۔ تم بھی آج سے بیٹھ
جاؤ۔ اور جلدی سے کہانی اپنے مستک میں
بٹھاؤ۔"

"اس میں بیٹھنے بٹھانے کی کوئی ضرورت
نہیں سیٹھ جی - کہانی تو بس ابھی منٹ
میں بیٹھ جاتی ہے - تم کسی ہیروئن کو بلا
کر میرے سامنے ننگا کھڑا کر دو۔"

ہی ہی ہی ——— !!!

ہو ہو ہو ——— !!!

ہا ہا ہا ——— !!!

سب ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگے تو ادھر سے آرٹ ڈائرکٹر شری آرتی پرشاد نے بھی ایک قہقہہ چھوڑا - بولا -

"اپن سالا اس پکچر کا ایسا سیٹ
لگائے گا کہ جو دیکھے گا اس کو
کھجلی لگ جائیں گا۔"

میز کے اس طرف ڈانس ڈائرکٹر گوالیا ڈرے منہ میں بیڑی لئے بیٹھا تھا - آنکھوں پر نیلے شیشوں کی گاگل - کنپٹیوں پر لانبی لانبی قلمیں بڑھا رکھی تھیں - فلمی انڈسٹری میں وہ سب سے بڑا رقاص مانا جاتا تھا - وہ ایک عمدہ فلیٹ میں رہتا تھا - ایک نفیس کار میں گھومتا تھا - ایک نفیس چھوکری کو اپنے ساتھ رکھتا تھا - کاریں اور چھوکریاں

بدلتے رہنا اس کی ہابی تھی۔ ہر قوم کی عورت چکھ چکا تھا اور کوئی جنسی بیماری ایسی نہ تھی جو اُسے نہ لگی ہو۔ سیٹھ وٹھل بھائی سے کہنے لگا۔

"اور دیکھو سیٹھ جی۔ اپن اس پکچر میں ایسا
ایسا ناچ دکھائیں گا۔ کہ سارا ہندوستان ننگا
ہو کر ناچنے لگے گا۔ ہمالہ پربت پر سب دیوی
دیوتا بھی ناچے گا دیوا گنڈ میں۔ اپن فلم انڈسٹری
کا شیو جی ہے۔ دولت کا ڈمرو بجائے گا۔
تم سالا سیٹھ بھی ناچنے لگے۔ تمہارا دھوتی
کھل جائیں گا۔ چوتڑ ننگا ہو جائیں گا"۔

گوالپاڑے اس وقت نشے میں تھا نہ جانے کیا بک رہا تھا سب ہنس پڑے تو سیٹھ نے بھی اس کی بات کا بُرا نہ منایا۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ اُدھر سے گوالپاڑے شراب کے نشے کی ترنگ میں اٹھا اور تالی سے نرتیہ کا بھاؤ بتا کے تین تال کی لے پر گورکھ کلیان کی آرد ہی امرو ہی کرتے ہوئے ناچ کی بول بانٹ کرنے لگا۔

تا تھئی تا تھئی
تت ترام تھئی تت ترام تھئی

تنا دِگ دِگ تھئی
تا تھئی تا تھئی

اور نہ جانے اتنے میں کیا جادو جگا دیا گوالپاڑے نے۔ کہ سب مست ہو کر جھومنے لگے۔ اور گوالپاڑے کے ساتھ آئی ہوئی چھوکری تو گھنگرو کی طرح چھنکنے لگی۔

اب اس چنڈال چوکڑی میں صرف ایک آدمی خاموش تھا۔ اور وہ کلا کار یعنی میوزک ڈائرکٹر دیپک۔ جو ہندوستانی فلم انڈسٹری میں گیت سنگیت کے بہترین ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے گیت اس کی دھنیں ملک بھر میں ہر دلعزیز ہو چکی تھیں۔ اس نے کامیابی کے لئے لوگ دھنوں میں فحش اور بازاری گیت گائے تھے۔ جبکہ وہ اس سے پہلے فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے جنتا کو بڑی عظیم دھنیں اور امر گیت بھی دے چکا تھا۔ اس کی وہ دھنیں وہ گیت بے شک امر تھے جن میں اس کے ملک کے کسانوں نے گندم اور دھان کی فصلیں بوئی تھیں۔ ہرے بھرے کھیت لہرائے تھے۔ ترنگا لہرایا تھا۔ مزدوروں اور کلا کاروں کے بازو لہرائے تھے لیکن فلم انڈسٹری تو ایک ایسا بوچڑ خانہ تھی جس میں اسے اپنی عظیم ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو ذبح کرنے کے ساٹھ ہزار روپے

مل رہے تھے۔ اس نے اپنے فن کو سونے چاندی کے مرگھٹ میں جلا کر بھبوت بنا دیا تھا۔

دیپک نے وہسکی کا ایک بہت بڑا پیگ ایک ہی سانس میں اندر انڈیل لیا۔ بولا۔

"میں اس پکچر میں ایسے گیت دوں گا کہ گنگا الٹی بہنے لگے گی۔ کیا گوری کیا کالی ہر چھوکری ایک گیت دکھائی دینے لگے گی۔ میں اُس پکچر کی ہر گندی گوٹ کو ایک سندر گیت بنا دوں گا۔ جو گیت سے جیا ستی گرم مسالہ ہوگا۔ سیٹھ میں فلم انڈسٹری کا بیجو باورا ہوں۔ تان سین ہوں"۔

یہ کہتے ہی دیپک نے ایک ایسی تان اڑائی کہ سب کے سب ادئی ادئی ہائے ہائے کرتے ہوئے لمبے پڑ پڑ گئے۔ سیٹھ وٹھل بھائی بولا۔

"اپن ابھی پبلسٹی منیجر بھٹاچاریہ کو بولے گا۔ کہ فلم نیوز اور فلم ویکلی میں فل پیج بکس کرا دے۔ پورا صفحہ"۔

فلمی بادن گزوں کی دھما چوکڑی میں میں بھی تھا۔ اور سب سے پیچھے نکر میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ سیٹھ وٹھل بھائی مجھ پر بڑا خوش تھا۔ میرے کام سے بڑا مطمئن تھا۔ دو ہفتوں میں میں نے پروڈکشن کے کاموں میں سیٹھ کے بیس ہزار روپیہ کی بچت کر کے دکھائی تھی۔ سیٹھ مجھ پر بڑا خوش تھا۔ جب بھی میرا جی چاہے بلا جھجک مجھے اس کے کمرے میں آنے جانے کی کھلی چھٹی تھی۔

میں بیٹھا بیٹھا اکتا گیا تھا۔ وہ خود تو شراب پی رہے تھے اور مجھے سگریٹ دے کر پرے سرکا دیا تھا۔ میں چپکے سے اٹھ کر کیبن کی اس طرف کی کھڑکی میں چلا گیا جو اُدھر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے بازار کا ناکہ تک دکھائی دیتا تھا۔ بنگالی چائے والے کی دکان ایکسٹراؤں سے بھری ہوئی تھی۔ پان والے کی دکان پر تین زنخے کھڑے کالا کاکڑا پان کھا رہے تھے۔ سڑک کے پار بوڑھا کباڑیہ اپنی گدی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بجلی کے تاروں پر دو کبوتر بیٹھے تھے۔ ان کے اوپر آسمان بے حد گدلا ہو رہا تھا۔ اتنے میں اُدھر سے سیٹھ وٹھل بھائی کی آواز آئی۔

"اے چھوکرا روپ کمار کیا ہے اُس باجو اُلو مافک کیا دیکھتا پڑا"

"مسر دکھتا ہے سیٹھ جی۔" میں نے جس کا فلمی نام روپ کمار تھا۔ سیٹھ سے کہا۔

"اس بابو آدمی کا دکھ ابھی گائب ہو جاتا۔" سیٹھ نے کہا۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر میز کے پاس آیا تو سیٹھ نے اُسے ہلکا سا پیگ دیا۔ میں نے رسمی طور پر پہلے تو انکار کیا اور پھر گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ سیٹھ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں کڑوی زہر شراب کو شربت کی طرح پی گیا تو سیٹھ بولا۔

"سالا تم چھوکرا چھپا رستم ہے۔ یہ اپن کو آج مالم ہوا۔ ایک پیگ اور پیو۔ پھر تمہارا موڈ بنے گا۔"

سیٹھ نے مجھ کو ایک اور پیگ دیا۔ اتنے میں پلائی ووڈ کا دروازہ کھلا اور سیٹھ دمڑیہ شمالی ہند کا سب سے بڑا ڈسٹری بیوٹر داخل ہوا تو سب لوگ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ جسم کی طرح سیٹھ دمڑیہ کا چہرہ بھی گول مول تھا جیسے تربوز پر خربوزہ رکھا ہو۔ سیٹھ کے ساتھ اس وقت دو ایگزی بیٹر یعنی نمائش کار بھی تھے۔ سیٹھ دمڑیہ شروع ہونے والی پکچر کا سیٹھ کو ایڈوانس دینے آیا تھا رسمی باتوں کے بعد کاروباری بات چیت شروع ہوئی تو سیٹھ دمڑیہ نے سیٹھ وٹھل بھائی کو پچاس ہزار روپے کا چیک دیا اور کنٹریکٹ

پر دستخط کروائے۔ تیار ہونے والی پکچر کے سیٹھ دمڑیہ نے شمالی ہند کے دیئے حقوق خرید لئے تھے۔ پچاس ہزار روپیہ ایڈوانس اور بقایا فلم کے مکمل پرنٹ مل جانے پر۔ معاملے کی بات طے ہو جانے پر سیٹھ دمڑیہ بس تھوڑی دیر وہاں بیٹھا اور پھر چلا گیا۔ تو ادھر کیبن میں بیٹھے ہوئے فلمی بادن گزوں نے پچاس ہزار کا چیک ایڈوانس ملنے کی خوشی میں سمندر کے کنارے پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ چاندنی رات میں سمندر کے کنارے شراب اور عورت کا ٹیکنی کلر پروگرام۔

سیٹھ وٹھل بھائی اٹھ کر اپنی کوٹھی چلا گیا تو میوزک ڈائرکٹر دیپک نے مجھے جلدی سے جلدی چھ پٹاخہ سی چھوکریاں پیدا کرنے کا آرڈر دیا۔ میں چونکہ پروڈکشن انچارج تھا لہٰذا یہ کام مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کی مدد سے جلدی سے چھ پٹاخہ سی چھوکریوں کا بندوبست کر دیا۔ ایکسٹرا لڑکیاں۔ اور ہم سب دو موٹروں میں گھسٹ کر بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے پہلے اوئی، ہائے، واہ، کی آوازیں نکالیں لیکن پھر ٹک کر بیٹھ گئیں۔ بس ایک نجمہ تھی جو ذرا ہٹ کر بیٹھی تھی۔ موٹریں دادر سے نکلیں خداداد سرکل پہنچیں اور وہاں سے تلک برج کو دکر کے سواجی پارک کی طرف گھوم گئیں۔ تو

پنجابی لڑکی نے جو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے میوزک ڈائرکٹر دیپک کی گود میں بیٹھی تھی۔ اس کے منہ کو اُدھر کرتے ہوئے بولی۔

"توبہ۔ مُنہ ہے کہ سنڈاس خانہ۔ ایسی گندی سانس" سب ہنس پڑے۔ نجمہ چل کر ذرا اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ڈانس ڈائرکٹر گوالیار ٹے اس پر گرا گرا پڑتا تھا۔ اور وہ سمٹ کر الگ ہو جاتی تھی۔ ڈائرکٹر جال مشتری اس لڑکی کو گود میں لئے بیٹھا تھا۔ جو بارہ برس سے فلموں میں کام کر رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں باندرہ کے چوراہے سے بھی آگے نکل گئیں۔ سانتا کروز کا اسٹیشن بھی گیا۔ جب موٹریں کالینا کی سڑک سے بھی آگے نکل گئیں تو ایک لڑکی کمودنی نے پوچھا۔

"تم ہم کو کدھر لے جا رہے ہو؟"

"بہار جھیل پر" جال مشتری نے جواب دیا۔

"وہاں کیوں؟" کمودنی نے پوچھا۔

"وہاں ہی تو تمہاری کھدائی ہوگی" جال مشتری نے کہا۔

"گاڑی روک دو"

"کیوں کیا؟"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی اپنے گھر جاؤں گی"۔

"نہیں ۔ نہیں تم ہمارے ساتھ چلو گی"۔

"نہیں جاؤں گی گاڑی روکو نہیں تو میں شور مچاؤں گی"۔

جال مستری نے غصے سے آرٹ ڈائرکٹر آرتھی کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی بغل میں بیٹھی لڑکی کی کمر ٹٹول رہا تھا۔

"میں کہتی ہوں گاڑی روکو نہیں تو میں اس کھڑکی سے باہر کود جاؤں گی"۔ کمودنی نے پھر غصے سے کہا۔

"اے آرتھی بابو موٹر روکو ۔ اس کو اتر جانے دو"۔ جال مستری نے کہا ۔ اور آرتھی نے موٹر روک لی ۔ کمودنی دروازہ کھول کر اتر گئی تو ایک لڑکی غصے سے بولی ۔ "ہونہہ بڑی شریف بنتی ہے"۔

دوسری بولی ۔ "نئی نئی آئی ہے ۔ تھوڑے دن اور کڑکی میں رہی ۔ بھوکی مری تو سیدھی ہو جائے گی"۔

اور وہ ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگیں ۔ موٹریں بہار جھیل کی طرف ۔۔۔ سڑک پر فراٹے بھرتی جا رہی تھیں۔

○

مہورت

جال منتری کی فلم "جوبن والی" کی مہورت ہو رہی تھی۔ سٹوڈیو میں پھول پھولوں کے ہار، ناریل، سیندور، لوبان، پھل، مٹھائیاں، تیار پڑی تھیں۔ فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے ہدایت کار، فنکار، ڈسٹری بیوٹر اور دوسرے معزز مہمان پہنچ چکے تھے۔ فقط پنڈت سورج گرہن چاند گرہن کے پونا سے یہاں پہنچنے کی دیر تھی۔

مہورت میں جہاں اور کئی فیشن ایبل عورتیں دعوت پر آئیں تھیں وہاں سیٹھ وٹھل بھائی کی داشتہ کدمبری بھی آئی تھی۔ ایک بڑی

حسین وجمیل عورت۔ باوجود اس کے کہ سٹوڈیو میں اس وقت کئی خوبرو فنکار موجود تھے۔ کدمبری کی نظریں میری طرف اٹھ جاتی تھیں اور میں اس سے غافل نہ تھا۔ کدمبری کے حسن نے میرا دل بھی موہ لیا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ ٹکٹکی لگائے اُسے بس دیکھتا رہوں لیکن سیٹھ جی کے خوف سے میں اُسے رہ رہ کر چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ پنڈت سورج گرہن چاند گرہن پونا سے پہنچ گئے۔ ویسے تو پونا اور بمبئی میں اس وقت کئی مشہور جوتشی تھے لیکن جو شہرت پنڈت سورج گرہن چاند گرہن کو حاصل تھی کسی کو نہ تھی۔

بمبئی میں فلم پروڈیوسر اپنی ہر فلم کی ابتدا مہورت سے کرتے ہیں جس کی تاریخ اور وقت کوئی جوتشی بتاتا ہے۔ مہورت پر ہیروئن کے ایک یا دو چار شاٹ لیے جاتے ہیں کیونکہ ہندو لوگ مذہبی عقیدے کے مطابق عورت کو لکشمی سمجھتے ہیں۔ دولت کی دیوی۔ پنڈت جی کے آتے ہی یہ رسم شروع ہوئی۔ اگنی کنڈ کے پاس بیٹھ کر پنڈت جی نے منتر پڑھے۔ اس کے بعد ایک ناریل توڑا جس کے پانی سے سیٹھ وٹھل بھائی کے ماتھے پر سیندور کا تلک لگایا۔ کیمرے پر پھول چڑھائے۔ اس کے بعد معزز مہمانوں کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ پھل اور مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اور مہورت شاٹ شروع ہوا۔ سٹوڈیو نمبر ۲ میں نیا سیٹ لگایا گیا تھا۔ فلم کی ہیروئن تھی دل بہار۔ جو اس سے پہلے دو فلموں میں کام کر چکی تھی اور فلمی دنیا کی مشہور

ترین ہیروئن بن گئی تھی۔ صرف دو فلموں کے ہٹ ہو جانے سے اس کی بہت بڑی مارکیٹ ہو گئی تھی۔ فلمیں اس کے نام پر بکنے لگی تھیں۔ وہ ایک فلم کا ساٹھ ہزار لینے لگی تھی۔ تیس ہزار وائٹ اور تیس ہزار بلیک۔

دل بہار میک اپ کر کے آئی تو مسٹر پال کیمرہ مین نے کہا۔

"میڈم اب آپ ذرا تکلیف کر کے فیلڈ میں آیئے"

اور وہ کرسی سے اٹھ کر اٹھلا کر چلتی ہوئی کیمرے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ کیمرہ مین نے کیمرے کی آنکھ سے اُسے دیکھا۔ اور اپنے اسسٹنٹ کو روشنیوں کے زاویوں کے بارے میں ہدایتیں دینے لگا۔

"نمبر ٹو آن"

"نمبر نائن سافٹ"

"نمبر ٹو میں ڈیفیوزر ڈالو"

"نمبر ون ذرا سا رائٹ لو"

"تھری میں شیشے کا ڈیفیوزر ڈالو"

اور پھر کیمرہ مین مسٹر پال نے ڈائرکٹر جالی مستری سے کہا۔

"آئی ایم ریڈی سر"

"اوکے"

ڈائرکٹر جال مستری اپنی جگہ سے اٹھ کر دل بہار کے پاس آیا۔ جو کہ اس وقت کیمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے دل بہار کو ہدایت دی۔

"دیکھئے اس فلم میں آپ نرتکی ہیں۔ رقاصہ ہیں۔ آپ ایک کلاکار سے محبت کرنے لگتی ہیں۔ مگر ہیرو بڑا شرمیلا ہے۔ آپ کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا۔ آپ اس کو زبردستی پکڑ کر اس کی چمی لیتی ہیں۔ یکدم جنٹی پنٹی شارٹ۔ پھر اس نے پوچھا۔

"سمجھ گئی ہیں آپ؟"

"جی ہاں"

"مکالمے یاد ہیں آپ کو؟"

"یاد ہیں"

اور پھر وہ فیلڈ سے ہٹ گیا۔ اس نے اپنے تھرڈ اسسٹنٹ سے کہا۔

"میڈم جہاں کھڑی ہے چاک کا نشان لگا دو"

اور پھر اس نے ہیروئن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میڈم شاٹ میں آپ کے منہ میں پان ہو گا۔ سگریٹ ہو گا۔ آپ پان چبائیں گی۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگائیں گی۔ آنکھیں مٹکائیں گی"

اور پھر اس نے کیمرہ مین سے کہا۔

"ریڈی مسٹر پال"

"یس ریڈی" ادھر سے مسٹر پال نے آواز دی۔

"فل لائٹس" کیمرہ مین کا چیف اسسٹنٹ چیخا۔ اور اتنی دیر میں سیکنڈ اسسٹنٹ نے ٹیپ سے ہیروئن کا فاصلہ ناپ لیا۔ تمام بتیاں ایک ساتھ روشن ہو گئیں۔

"فین آف" ڈائرکٹر نے حکم دیا اور پنکھا بند کر دیا گیا۔ ڈائرکٹر کا تھرڈ اسسٹنٹ کلیپر لے کر اور نمبر لکھ کر ہیروئن کے آگے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر ریکارڈسٹ کو بتا دیا تھا۔

"سٹارٹ پلیز" ڈائرکٹر جال ہنری کی آواز سنائی دی تو اس کے اسسٹنٹ نے کلیپر سیدھا کر لیا۔ وہ کلیپر لے کر ہیروئن کے منہ کے برابر کیمرہ کی طرف کھڑا تھا۔ فلور پر اتنی خاموشی تھی کہ زمین پر سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ باہر خاموش رہنے اور شور نہ کرنے کی گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی۔ پھر خاموشی ہو گئی۔ کیمرہ مین نے کہا۔

"اسٹارٹ پلیز"

"اسٹارٹڈ" ریکارڈنگ روم سے آواز آئی۔ کیمرہ مین نے کہا۔

"کلیپ"

اور کلیپر لڑکے نے کلیپ زور سے دی۔ اور جھٹ کیمرے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اس شاٹ پر مہورت کی رسم ختم ہوئی۔ سب لوگ جانے لگے تو کد مبری نے چور نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ ادھر سے میں مسکرایا تو وہ آنکھیں نیچی کر کے شرم سے سمٹتی ہوئی اپنی نئی ماڈل امریکن بیوک پر سوار ہو گئی۔

پیار کی آگ دونوں طرف سلگ چکی تھی۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ ظالم باز آ۔ یہ میرے مالک کی بیوی ہے۔ سیٹھ کو پتہ چل گیا تو مجھے سٹوڈیو سے نکال دے گا۔ لیکن دل ایسا خانہ خراب ہے کہ کسی طرح نہ مانا۔ مچلنے لگا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ دیکھو اگر تم مجھے یوں ستاؤ گے تو میں تمہاری پسلیاں توڑ کر باہر نکل جاؤں گا۔

بس تو نہ دل مانا نہ میں مانا۔ ادھر بھی پیار تھا اُدھر بھی پیار تھا۔ پیار نے چھپ چھپ کر ملنے کے کئی راستے نکال لئے۔ کد مبری مجھے اکثر ملنے لگی۔

اُس دن ڈائرکٹر جال مستری کی نئی فلم کی مہورت نہ ہوئی تھی بلکہ میرے نئے پیار کی مہورت ہوئی تھی۔

سلولائڈ

کی

سلوچنا

کدمبری نے مجھے باتوں ہی باتوں میں سیٹھ وٹھل بھائی کی کئی باتیں بتا دی تھیں اُس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ سیٹھ نہ عورت ہے نہ مرد بیچ بیچ کی کوئی چیز ہے۔ اور پھر اس نے مجھے یہ بھی بتایا۔

"سیٹھ سے مجھے اس لئے بھی نفرت ہے کہ وہ بڑا خبیث ہے۔"

"کیوں خبیث کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ ایک بڑی ذلیل حرکت کرتا ہے"۔ کدمبری نے جواب دیا۔

"کیا حرکت؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی دکھا سکتی ہوں" کدمبری نے کہا۔

"کیا؟"

"کچھ ہے"

"کچھ پتہ تو چلے"

"آج رات کو تم مجھے بنگلے میں ملنا۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گی"

"اچھا"

"ہاں"

اس رات کو شوٹنگ نہ تھی رات بڑی تاریک تھی آسمان بادلوں سے گدلا ہو رہا تھا۔ بارش کم تھی مگر ہوا کے زور سے اس قدر فراٹوں میں آتی تھی۔ کہ بنگلے کے سب نوکر چاکر کمروں میں پڑے سو رہے تھے۔ صرف کدمبری ایسی تھی جس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ بنگلے کے دروازے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی پیپل کا پیڑ تھا۔ جس کی پھیلی ہوئی شاخیں اُسے بھیگنے سے بچا رہی تھیں۔

وہ مجھے جلدی سے ایک کمرے میں لے گئی۔ گرچہ میں ٹیکسی میں وہاں پہنچا تھا لیکن پھواروں سے میرے کپڑے کچھ کچھ گیلے ہو رہے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کدمبری نے بتی بجھا دی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر چپکے چپکے اندھیرے میں باتیں کرتے رہے۔

اور پھر کدمبری مجھے دبے پاؤں ایک اور کمرے میں لے گئی جس کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن کھڑکیوں کے شیشوں میں سے کمرے میں ہلکی ہلکی دودھیا روشنی جھلک رہی تھی۔ کدمبری مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک کھڑکی کے پاس لے گئی۔ جس کا ایک شیشہ نیچے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ جھکتے ہوئے کدمبری نے شیشے میں اُس شگاف سے اندر نظر دوڑائی۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے ہٹ گئی۔ میرے کان سے منہ لگا کر سرگوشی میں بولی۔

"یہاں سے اندر جھانک کر دیکھو۔"

میں نے اس شگاف سے آنکھ لگا دی۔ جس طرح بچے بیر بین سے آنکھ لگا دیتے ہیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں میں نے دیکھا کہ سیٹھ وٹھل بھائی صوفے میں بیٹھا تھا۔ سامنے تپائی پر شراب کی بوتل، گلاس اور کھانے پینے کی چیزیں رکھی تھیں۔ وہ شراب پیتے ہوئے فلم ویکلی اخبار دیکھ رہا تھا۔

"سیٹھ جی شراب پی رہے ہیں۔ اور فلمی اخبار دیکھ رہے ہیں۔" میں نے پیچھے ہٹ کر دبی آواز میں کدمبری سے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں تم ایک عجیب تماشہ دیکھو گے۔" کدمبری نے کہا۔

"کیا تماشہ؟" میں نے پوچھا۔

"بس تم خاموش رہو اور دیکھتے جاؤ۔ ابھی سیٹھ شراب کے نشے سے پاگل نہیں ہوا" کدمبری نے کہا۔

"اچھا تو شراب پیتے پیتے اس کے نشے میں سیٹھ پاگل ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ اور دیکھنا کیا پاگل پن گھولے گا۔"

کدمبری نے بہت ٹھیک کہا تھا۔ شراب کے نشے میں سیٹھ جب گھٹ ہو گیا تو پاگل پن گھولنے لگا۔ سامنے ایک قد آدم الماری تھی۔ جسے تالا لگا ہوا تھا۔ سیٹھ نے تالا کھول کر اس میں سے اپنے قد اتنی سلولائیڈ کی بنی ہوئی ایک عورت نکالی۔ سلولائڈ کی عورت۔ جو جیتی جاگتی معلوم ہوتی تھی۔ بڑی خوبصورت۔ نہایت ہی نفیس ساڑھی میں ملبوس۔ پاؤں میں لفٹی۔ کدمبری سے زیادہ خوبصورت اس میں وہ سب کچھ تھا جو عورت کے جسم میں ہوتا ہے۔ سیٹھ اُسے گود میں لئے صوفے پر لے گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے ایک بٹن دبایا تو سلولائڈ کی عورت بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگیں اکٹھی

ہو گئیں - پھر سیٹھ نے ایک اور بٹن دبایا تو سلولائڈ کی عورت آنکھیں مٹکاتے ہوئے ہونٹ ہلاتے ہوئے باتیں کرنے لگی - ہر حرکت تو جیتے جاگتے ہونٹوں کی سی تھی مگر آواز نہ تھی - اور یہ کمی سیٹھ اپنی آواز میں پوری کر رہا تھا -

"آدھی رات، شراب، سناٹا" سیٹھ نشے میں سلولائڈ کی عورت کے ساتھ باتیں کر رہا تھا -

"تم بڑی سویٹ ہو ڈارلنگ"

یہ کہتے ہی سیٹھ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا ...... اور اس کے ہونٹ چومنے لگا -

"سلوچنا - ڈارلنگ سلوچنا"

اور کدمیری نے میرے کان سے ہونٹ لگاتے ہوئے کہا -

"دیکھا تم نے - یہ کتنا بڑا حرامزادہ ہے - یہ کیا کر رہا ہے"

"چپ رہو ڈارلنگ چپ رہو - مجھے سیٹھ کی ایکٹنگ دیکھنے دو" میں نے کہا -

سیٹھ اس وقت ہیرو بنا ہوا تھا - سلوچنا تو اس وقت بیچاری بوڑھی ہو چکی تھی - لیکن اس کی محبت سیٹھ کے دل میں ابھی تک جوان تھی - معلوم ہوتا تھا - جب سلوچنا تھی اور فلموں میں کام

کرتی تھی سیٹھ نے اُسے کسی فلم میں دیکھا ہوگا اور اس کا دل لبلبا بن بیٹھا ہوگا۔ سلوچنا ہتھے نہ چڑھی تو سلولائڈ کی سلوچنا بنوالی۔

"ڈارلنگ میرے ہاتھ میں جام ہے۔ دوسرے میں تمہاری کمر ہے۔ اور ہم دونوں کے بیچ میں بلیک ڈاگ کی بوتل رکھی ہے۔ تم بھی پیو" شراب کے نشے میں سیٹھ بدستور بکواس کیے جا رہا تھا۔

اور پھر اس نے گلاس میں شراب سوڈا ڈال کر گلاس سلولائڈ کی سلوچنا کے ہونٹوں سے لگا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا شراب کا ایک گھونٹ لیا۔ گلاس پھر سلولائڈ کی سلوچنا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پھر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ اور پورا گلاس اُس نے اسی طرح ختم کیا۔ اور بہک ہوگیا۔ آؤٹ ہوگیا۔

سلولائڈ کی سلوچنا کو سینے سے لگائے مرنے پر سے اٹھا۔ سامنے پلنگ پر بڑا نفیس بستر بچھا تھا۔ وہاں پہنچ کر سیٹھ نے سلولائڈ کی گڑیا کی قمیض اتاری۔ ساری اتاری۔ سلولائڈ کی سلوچنا ننگی ہوگئی۔ بس ایک اس میں جان نہ تھی ورنہ عین عین عورت کی ہر چیز موجود تھی اس میں۔

"دیکھا تم نے یہ حرامزادہ اب کیا کرنے لگا ہے" کدمبری نے دبی آواز میں میرے کان میں کہا۔

"خاموش - خاموش - مجھے دیکھنے دو اب کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔

مگر اب کمرے میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ لیکن سیٹھ کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔

"سلوچنا - مائی ڈارلنگ - او مائی ڈارلنگ۔"

اب مجھے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سیٹھ نے بتی بجھا دی تھی۔

"یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟" میں نے کدمبری سے پوچھا۔

"جیتی جاگتی عورتوں کے ساتھ جو ایسا نہیں کر سکتا۔" کدمبری نے جواب دیا۔

"اسے یہ کیا بیماری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھرکی ہے - ٹھرکی - اور کچھ نہیں ہے اس کے پاس۔" کدمبری نے کہا۔

"کیا یہ تمہارے ساتھ پیار نہیں کرتا؟" میں نے پوچھا۔

"کرتا ہے - لیکن بھو کے پیار میں کیا مزا - پیار کرتے کرتے اسے پسینہ آجاتا ہے - اس کی سانس پھول جاتی ہے - مجھ سے ڈرنے لگتا ہے۔" کدمبری نے کہا۔

"اس مصنوعی عورت سے تو نہیں ڈرتا۔" میں نے کہا۔

"اس لئے کہ یہ مصنوعی عورت ہے۔ سلو لائنڈ کی عورت ہے۔ سلو لائنڈ کی سلوچنا" کدمبری نے کہا۔ اور مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ جس میں بدستور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اب کدمبری بھی مجھے اندھیرے میں سلو لائنڈ کی سلوچنا دکھائی دے رہی تھی۔

"سلو لائنڈ کی یہ سلوچنا سیٹھ نے کہاں سے لی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فرانس سے منگوائی ہے سیٹھ نے پندرہ ہزار روپیہ میں" کدمبری نے کہا۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کدمبری سے پوچھا۔

"شراب کے نشے میں سلو لائنڈ کی سلوچنا سے پیار کرتے ہوئے سیٹھ نے خود ہی یہ بھید کھول دیا تھا" کدمبری نے کہا۔

اتنے میں بادل گرجا۔ بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

○

عشق پیچ روز نہیں

میری سیٹھانی کدمبری مجھ پر بڑی مہربان ہورہی تھی۔اس کو مجھ سے عشق ہوگیا تھا۔ہم دونوں سیٹھ وٹھل بھائی سے چھپ چھپاکر اکثر ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ اور خوب سیر سپاٹے کیا کرتے تھے۔ہم کبھی چوپاٹی چلے جاتے کبھی باندرے۔کبھی تاج محل میں کھاتے پیتے۔ کبھی کوئی اچھی سی پکچر دیکھنے کسی سینما میں چلے جاتے۔اس دن بھی ہمارا سیر سپاٹے کا پروگرام تھا۔

بائی کلہ اسٹینڈ پر میں نے زور سے سیٹی بجائی۔تو ایک خالی ٹیکسی چکر

لگا کر بڑے زناٹے سے ہمارے قریب آکر فٹ پاتھ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے ٹیکسی دروازہ کھول کر جھکتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"اندر چلئے ملکہ عالم۔"

کدمبری اندر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا۔

"کہاں چلو گی ڈارلنگ؟" میں نے کدمبری سے پوچھا۔

"جہاں تمہارا جی چاہے۔" کدمبری نے کہا۔

اُدھر سے ڈرائیور کی آواز آئی ——"سیٹھ کدھر چلیں گا۔؟"

"کولابے۔" میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کر اپنی ٹوپی ٹیڑھی کی اور ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔ اور کدمبری ایک دھکے سے میری گود میں آ پڑی۔ اُس نے کوئی بڑا ہی پیارا سینٹ لگایا ہوا تھا۔ جس کی مہک سے طبیعت خوش ہو گئی۔ کدمبری نے جلدی سے اپنے آپ کو مجھ سے الگ کیا اور اپنی سیٹ پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔

کولابے میں ڈربن جنٹس فشو کی دکان پر کدمبری نے ٹیکسی رکھنے کو کہا۔ اور مجھے ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔ اندر جاتے ہی ایک بانکی چھریری سی اینگلو انڈین لڑکی سے کہا۔

"صاحب کے لئے کوئی بڑھیا سا بوٹ لاؤ۔"

وہ لے آئی۔ کدمبری نے مجھ سے کہا۔ "ٹرائی کرو۔"

شو بڑا ہی نفیس تھا۔ کرکوڈائل سکن۔ لیکن ذرا کھلا تھا۔ وہ بانکی چھریری چھوکری بولی۔

"میں آپ کے سائز کا شو لاتی ہوں۔"

"ہاں۔ میں ذرا تنگ شو پسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ ایک اور بڑا نفیس شو لے آئی۔ جو مجھے بالکل فٹ تھا۔ قیمت تھی۔ اس کی پچاس روپے جو کدمبری نے ادا کر دی۔ میں نیا شو اتار کر پرانا پہننے لگا تو کدمبری بولی۔

"اونہہ۔ یہی پہنے رہو۔"

"اور یہ پرانا؟" میں نے پوچھا۔

"باہر جو بھکاری کھڑا ہے اُسے دے دو۔"

اور میں نے دکان سے باہر نکلتے ہی اپنا پرانا شو بھکاری کو دان کر دیا۔ کدمبری اپنی انگوری رنگ کی بڑی ہی دلکش ساڑھی کو سنبھالتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ چلتے چلتے خود بخود اس کی پتلی سی کمر کا پہلی کے چاند کا سا خم ابھر آیا۔ سینہ ابھر آیا۔ چال میں اور زیادہ بانکپن اور ادا پیدا ہو گئی۔ ہم دونوں پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میں نے

ڈرائیور سے کہا۔

"سیٹھ انڈیا گیٹ چلو۔"

جب گاڑی فورٹ ایریا سے گزری تو کدمبری نے مجھ سے کہا۔

"گاڑی رکواؤ۔"

میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "سیٹھ گاڑی روکو۔"

اس نے گاڑی روک لی۔ سامنے رائٹ لیڈلا کی ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان تھی۔ کدمبری مجھے اندر لے گئی۔ شوکیسوں میں بڑے نفیس ریڈی میڈ سوٹ لٹک رہے تھے۔ کدمبری بولی۔

"کوئی بڑھیا سا سوٹ پسند کرو۔"

میں نے پک اینڈ پک کا سوٹ پسند کیا۔ سیلز مین مجھے اندر ڈریسنگ سرکل میں لے گیا۔ ایک سجا ہوا کمرہ۔ جس میں چاروں طرف بڑے بڑے شیشے دیواروں سے لگے ہوئے تھے۔ ریڈی میڈ کپڑے خریدنے والے خریدے ہوئے کپڑوں کی اپنے جسم پر ٹرائی اسی کمرے میں کرتے تھے۔ میں نے اپنا پرانا سوٹ اتار کر نیا پہن لیا۔ بالکل فٹ تھا۔ جیسے وہ میرے لئے ہی بنایا گیا تھا۔

سیٹھ وٹھل بھائی کی دولت سے میں خوب گلچھرے اڑا رہا تھا۔ کوئی کمائے کوئی کھائے۔ سیٹھ کی دولت کدمبری مجھ پر اندھادھند

نچھاور کر رہی تھی۔ اُس نے مجھے اُسی دن ایک بہترین گھڑی، ایک بٹوہ اور ہیرے کی ایک انگوٹھی بھی خرید کر دی۔

انڈیا گیٹ پہنچ کر ہم دونوں ٹیکسی سے اترے۔ وہاں ایک ننگا فقیر کپڑوں کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"بابا میں ننگا ہوں۔ خدا کے نام پر دو

کپڑے لے دو"

میں نے اپنا پرانا سوٹ اُسے دان کر دیا۔ سمندر کے کنارے اونچی اونچی دیوار تھی۔ میں نے بازو گھما کر اپنا پرانا بٹوہ سمندر میں پھینک دیا۔ انڈیا گیٹ میں بڑی بڑی نفیس چھوکریاں چہل قدمی کر رہی تھیں ساری کے جسم کا جغرافیہ ساڑھیوں سے چھلک چھلک کر باہر آ رہا تھا۔ ایک چھوکری تو ان میں بس قیامت تھی۔ خوبصورتی کی اٹلس۔ کدمبری مجھے چور آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ میں ان میں سے کسی کو دیکھ تو نہیں رہا۔ میں ہرجائی تو نہیں۔ لیکن میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا۔ بڑا چوکس تھا۔ جب کوئی گڑیا سی لونڈیا میرے پاس سے گزرتی میں یوں آنکھیں بند کر لیتا جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر بند کر لیتا ہے۔

ہرے ناریل، چیکو، چٹپٹے چنے۔ ڈھابے والے آوازیں لگا رہے تھے۔ میں نے ایک ہرے ناریل کا پانی پیا۔ کدمبری بولی۔

"میں تو کھٹی میٹھی چاٹ کھاؤں گی۔"

چوپاٹی پر ہم نے کھٹی میٹھی چاٹ کھائی۔ وہاں سے کولابے واپس آکے ہم نے سالزبرگ میں ٹوٹی فروٹی آئس کریم کھائی۔ اس کے بعد ہم لبرٹی کے سامنے گئے۔ یہاں میں نے اور کدمبری نے سنگترے کا رس پیا۔

یہاں ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ رس والے کے اسٹینڈ کے نیچے کھڑے میں لبرٹی کی رنگارنگ روشنیاں کدمبری کے چہرے پر تھرکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہرا، لال، نیلا، پیلا، گلابی، نارنجی کتنے ہی خوبصورت جواہرات کے سے رنگ کدمبری کے چہرے پر تھرکتے رہے۔

بارش دھیرے دھیرے ہو رہی تھی۔

بارش، روشنیاں، پھواروں کی دھند، جل پری کا جسم رکھنے والی کدمبری کسی پراسرار خوشبو کی طرح مہک رہی تھی۔ جیسے سمندر کے کنارے کسی نے اگربتی جلا دی ہو۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کئے رس کا گھونٹ پیا۔ آہستہ آہستہ جیسے میں رس کی مٹھاس میں کدمبری کو گھول پی رہا تھا۔

اور پھر ایکا ایکی بارش تیز ہوگئی۔ ہم دونوں ٹیکسی میں چلے آئے۔

ٹیکسی چلنے لگی۔ بارش کے تیز تیز چھینٹے زور دار سرسراہٹ سے کانچ کی کھڑکیوں سے ٹکرا کر جلترنگ کی طرح بجنے لگے۔ باہر بارش کا طوفان تیز ہو رہا تھا۔ لیکن ٹیکسی کے اندر بڑی خاموشی تھی۔ بڑا سکون تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔ یہ لمحہ کتنا دلکش و دلفریب ہے وقت کے سمندر کا گنگناتا ہوا ایک مسرور قطرہ۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں اس لمحے کو کبھی گزرنے نہ دوں۔

بارش پھر رک گئی تھی۔ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ اب ہم میرین ڈرائیو کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ اور بند کے اس کنارے کی طرف جا رہے تھے جو سمندر کے بیچ چلا جاتا ہے۔ ہمارے چاروں طرف دھند ہی دھند تھی۔ ہم دونوں پتھروں پر بیٹھ کر خاموشی سے سمندر کی لہروں کو پتھروں سے ٹکرا کر واپس جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اور پھر کدمبری نے کہا۔

"روپ کمار۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

"یہاں چنوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔" میں نے کہا۔

"وہی لے آؤ۔" کدمبری نے کہا۔

گرما گرم کنکنے، بھربھرے، خستہ بھنے ہوئے چنوں کی دانتوں تلے کڑک کڑک آواز سمندر کے کنارے سرسراتی ہواؤں میں

کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میں چنے لینے چلا گیا۔ وہ مجھے دور تک دھند میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ میرین ڈرائیو کی بلڈنگیں سطح زمین سے اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اور دھند میں لپٹے ہوئے جہازوں کی طرح کانچ کی اپنی روشن کھڑکیاں کھولے ہوئے تھیں۔ اور ان بلڈنگوں سے پرے ایروس تھیٹر کی گرجے کی شکل کی آخری منزل کسی بادبانی جہاز کے لمبے مستول کی طرح دھند میں بڑی پر اسرار معلوم ہو رہی تھی سا اور ٹیک ویو کے گھر چھوٹے چھوٹے ڈونگوں کی طرح اپنے لنگر سے اکھڑ کر دھند میں بہے جا رہے تھے۔ میں چنے لے آیا۔ ہم دونوں چنے کھاتے رہے۔ ہمارے دانتوں تلے ان کی کڑک کڑک آواز سرسراتی سمندری ہواؤں میں بہت بھلی معلوم ہوتی رہی دور کہیں کسی بلڈنگ میں کانچ کی کوئی روشن کھڑکی کھلی اور پیانو کی آواز دھند کے بہاؤ پر بہتی ہوئی ہمیں چھونے لگی۔ تھوڑی دیر ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر میں نے دھیرے سے کرمبری کو کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا جسم کانپا تو میں نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

دھند بہتی چلی گئی ۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے ہم دونوں پیار کے ایک جزیرے میں ہیں اور چاروں طرف وقت کا سمندر بہہ رہا ہے ۔ میں نے وقت کے سمندر کا ایک اور مہکا مہکا قطرہ ایک اور بوسہ اس کے ہونٹوں پر ٹپکا دیا ۔

○

بمبئی کے ہینگنگ گارڈن

ہینگنگ گارڈن کے سامنے ڈی لکس ہوٹل تھا۔ جس کے تین مالے تھے۔ اور بالکل ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن — ہم اور کدمبری تیسرے مالے کے کھلے فرش پر چلے گئے۔ ہم نے ایک بیرے سے کہہ کر ایک چھوٹی میز اور دو کرسیاں لوہے کے جنگلے کے پاس سرکا کر بچھا لیں۔

یہاں سے بمبئی کا شہر چاروں طرف پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنیاں۔ آسمان پر چاروں طرف ٹمٹماتے ہوئے ستارے۔ اور میرین ڈرائیو کے نیم دائرے میں نیلی نیلی روشنیوں

کی قوس ۔ ہوا میں رات کی رانی کے پھولوں کی مہک گھلی ہوئی تھی ۔ نیچے ادھر چوپاٹی کی ریت پر ایک گوانیز سمندر کے کنارے کلارنٹ بجا رہا تھا ۔ اوپر کھلے ارغوانی آسمان اور روشنیوں کی جھالروں میں بمبئی کا خوبصورت شہر الف لیلےٰ کا کوئی شہر معلوم ہو رہا تھا۔

میں اور کدمبری اس وقت بمبئی کی فلم انڈسٹری کی باتیں کر رہے تھے ۔ جس میں اچانک ایک بڑا ہی عجیب انقلاب آگیا تھا۔ خام مال کی بڑی قلت کی وجہ سے نئی فلمیں نہیں بن رہی تھیں ۔ اور جو فلمیں بن رہی تھیں ۔ رکی پڑی تھیں ۔ بہت سے سٹوڈیو میں لائٹ مینوں ...... اور دوسرے مزدوروں کو تنخواہ ملے چھ چھ مہینے گزر گئے تھے ۔ چیمبور میں ایک سٹوڈیو بند ہونے والا تھا ۔ آندھیری میں روہنی سٹوڈیو میں بھی کئی روز سے کام نہیں ہو رہا تھا ۔ بہت کم تصویریں بن رہی تھیں ۔ ایکسٹرا لوگ تو بے کار ہو رہے تھے اب اس کا اثر دوسرے درجے کے اداکاروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کی گاڑیاں گروی ہو کے کالبا دیوی روڈ کے سیٹھوں کے پاس پہنچ چکی تھیں ۔ یہی لوگ تھے جو انڈسٹری میں روپیہ بھی لگاتے تھے ۔ جب ان بنیا لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو سرمائے کی شرح سود بھی بڑھا دی تھی ۔ پہلے تیس چالیس فی صدی

پر روپیہ مل جاتا تھا۔ اب پچھتر فی صدی پر ملنے لگا تھا۔ ایک لاکھ روپے پر پچھتر ہزار سود۔ یعنی ایک لاکھ روپے پر پچھتر ہزار سود دو تو فلم بناؤ۔ ایسی حالت میں بھلا کون تصویر بنا سکتا تھا۔

بمبئی کی فلم انڈسٹری میں اس وقت کوئی تیس پینتس ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ جن میں سے سو، دو سو کو چھوڑ کر باقی سب کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ کالبا دیوی روڈ پر ایک سندھی سیٹھ کی پیڑھی تھی۔ وہ سیٹھ پروڈیوسروں کی نامکمل فلمیں گروی رکھ رہا تھا۔ سندھی سیٹھ کا نام تھا چھیدی مل۔

دن اور راتیں مہینوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں لیکن فلمی صنعت کا بحران ختم نہ ہو رہا تھا۔ کہانیاں لکھنے والے منشی جگر، منشی دل، منشی بسمل، منشی گھائل، منشی خنجر، منشی ناوک، منشی درد، منشی داغ، منشی پنچھی، منشی دیوانہ ایسی ہستیاں ڈاک خانوں کے باہر خطوط نویسی کر کے پیٹ پالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایوننگ نیوز ان فلم ایکٹروں کی تصویریں شائع کر رہا تھا۔ جو فاقوں سے مجبور ہو کر بوٹ پالش اور تیل مالش کرنے لگے تھے۔ مختلف سٹوڈیو میں لائٹ مینوں نے اپنی اپنی یونین بنا لی تھی۔ کئی سٹوڈیوز میں ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے

ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بہت سی آدھی چوتھائی تصویریں ڈبوں میں بند پڑی تھیں۔ نئی تصویریں بہت کم شروع ہو رہی تھیں۔ مہورت بہت کم ہوتے تھے۔ مہورتیوں کو فاقے تنگ کر رہے تھے۔

بمبئی میں مہورتیے ان لوگوں کو کہتے ہیں۔ جو بن بلائے ہر فلم کی مہورت میں جا گھستے ہیں اور وہاں سے مٹھائی اور چائے کھا پی کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ بمبئی فلم انڈسٹری ایسے لوگوں کے لئے ایک ایسا لنگر خانہ ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا۔ ہر روز کسی نہ کسی اسٹوڈیو میں کسی نہ کسی فلم کی مہورت ہوتی ہے۔ مہورتیے لوگ بس ہر وقت یہی سراغ لگانے میں لگے رہتے ہیں کہ آج کون سے سٹوڈیو میں مہورت ہے۔

دادر مین روڈ پر ہر طرف دھواں دھواں منظر تھا۔ کبھی ایسا سناٹا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ کبھی ایسا شور و غوغا کہ بھوکے ایکٹر آپس میں سر پھٹول کر رہے تھے آپس میں ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ کسی کا سر کھل رہا تھا کسی کے چنے سوچ رہے تھے۔ مار دھاڑ کی اسٹنٹ فلموں کے ڈائرکٹروں نے ہرے ناریل، چیکو اور چٹپٹے چنے بیچنے شروع کر دیئے تھے۔ ہارن بی روڈ کے مرکزی دفتر

ایمپلائمنٹ ایکس چینج کے باہر ایکسٹرا کی لڑکیوں اور دوسرے تیسرے درجے کے ایکٹروں کا صبح سے شام تک تانتا لگا رہتا تھا۔ فلمی صنعت کے اس زبردست بحران میں ڈسٹری بیوٹروں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ مارکیٹ کے اندازے کے مطابق سرمائے کی کمی کے باعث اور اس پر سود در سود کے باعث تصویریں بنانے کے حق میں نہ تھے۔ اور پھر شروع ہونے والی فلموں میں پروڈیوسر بالکل کسی نئے چہرے کو لے کر خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔

جال مستری اپنی فلم "جوبن والی" میں مجھے ہیرو لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس صنعتی بحران میں اب مجھے ہیرو لینے کو تیار نہ تھا۔ صرف یہی ایک فلم تھی جو سیٹھ وٹھل بھائی کے سٹوڈیو میں تیار ہو رہی تھی۔ باقی زیر تکمیل فلموں کا کام روک دیا گیا تھا۔

اگر سیٹھ وٹھل بھائی اپنا سرمایہ لگا رہا ہوتا تو اس فلم کا کام رک جانا بھی یقینی تھا۔ لیکن اس فلم کا سرمایہ کار یعنی فنانسر سیٹھ دھرم بیر تھا۔ اور اب تک دو لاکھ روپیہ ایڈوانس دے چکا تھا۔ لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے یہ پکچر تیار ہو جائے۔ پوری پکچر پر وہ تین لاکھ روپیہ صرف کرنا چاہتا تھا۔ وہ اگر فلمی بحران کو دیکھتے ہوئے کام بند کروا دیتا تو اس کا دو لاکھ روپیہ گھٹے میں پڑ جاتا۔ لیکن

اتنی رقم کو کھٹے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ سیٹھ دم ڑیہ زور دے رہا تھا کہ یہ فلم جلدی سے تیار ہو جائے۔

"آج تم اتنے چپ کیوں ہو روپ کمار؟" کدمبری نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے تو رہ رہ کر بڑا خیال آ رہا ہے کدمبری" میں نے کہا۔

"کیسا خیال؟" کدمبری نے پوچھا۔

"میں فلمی دنیا میں بالکل نیا رنگروٹ ہوں۔ ایسے وقت میں جبکہ کئی پکچروں میں کام کر چکنے والے ایکٹروں کو کام نہیں مل رہا۔ جال مستری مجھے اپنی فلم میں ہیرو نہیں لے گا"

"وہ کیا اس کا باپ بھی تم کو اپنی پکچر میں ہیرو لے گا" کدمبری نے کہا۔

"پرسوں مجھے سیٹھ نے دو تصویریں دکھائی تھیں"

"کس کی تصویریں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تمہاری ایک سوشیل کمار کی" کدمبری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ نے پوچھا۔ بتاؤ کرم کونسا فیس اپن کی نئی فلم میں اچھا رہے گا؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تمہاری تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ سیٹھ جی۔ یہ فیس بہت اچھا ہے۔ ایسا فیس اپنی فلمی دنیا میں نہیں۔ یہ چلے گا۔"
کدمبری نے کہا۔

"پھر سیٹھ نے کیا جواب دیا۔؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھ بولا۔ یہ نیا رنگروٹ ہے۔ فلم کہیں فلاپ نہ ہو جائے۔"
کدمبری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر میں نے سیٹھ کو بڑا زور دیا۔ میں نے بولا۔ سیٹھ یہ بہت اچھا فیس ہے۔ چلے گا۔ ضرور چلے گا۔"

"اچھا تو چلے گا کدم۔ سیٹھ نے کہا۔ اپن جال مستری سے بولے گا سوشیل کمار نہیں روپ کمار چلے گا۔ پکچر میں۔"

"اور جو جال مستری نے مجھے اپنی فلم میں لینے سے انکار کر دیا۔"
میں نے کہا۔

"جب سیٹھ بولے گا روپ کمار کو اپنی پکچر میں لو تو جال مستری کیسے نہیں لیں گا سالا جو نہیں لیں گا تو اپن اس کی اچھی طرح خبر لے گا۔ سیٹھ کا اچھی طرح خبر لے گا۔" کدمبری نے کہا۔

اتنے میں ہماری پچھلی طرف ایک آواز گرجی۔ "کلموہی۔ گندی گیتیا۔" یہ سیٹھ کی آواز تھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو سیٹھ پستول

تانے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ وہ غصے سے دانت پیس رہا تھا۔ بولا۔

"اپن کو آج پتہ چلا کلموہی تو روپ کمار کی طرفداری کیوں کرتی تھی۔ اپن خبر نہیں تو اس مسٹنڈے کے سنگ ایلی گیلی پھرتی۔ عشق بازی کرتی۔ اپن پہلے اس کتے کو گولی مارے گا۔ یہ وفادار نہیں۔ نمک حرام نکلا۔ اور پھر تم کو گولی مارے گا۔ نمک حرام کتیا۔ اپن تم کو اپن کا خون پلاتا اور تو اس مسٹنڈے کے گیل مجے اڑاتا پھرتا۔"

اتنا کہنے کے بعد سیٹھ پستول تانے غصے میں میری طرف بڑھا تو کدمبری میرے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی۔ چمک کر بولی۔

"پہلے اپن کو گولی مارو سیٹھ۔ اپن کی جندگی میں اس پر گولی چلا نہیں سکے گا۔"

سیٹھ کا کیشئر یعنی خزانچی اور سٹوڈیو میں کام کرنے والے ایک دو ملازم بھی ساتھ تھے۔ سیٹھ کا خزانچی جرجی لعل ادھیڑ عمر کا انسان بڑا سمجھدار تھا۔ اس نے چپکے سے سیٹھ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"گڑبڑ نہ کرو سیٹھ۔ آپ کا بدنامی ہوئیں

گا۔ تریا ہٹ بالی ہٹ کو سبھی جانتے

ہیں۔ مٹی ڈالو اس بات پر۔ سیٹھانی کا

باجو پکڑو اور گھر کو چلو۔ اس بدمعاش

کا حساب صاف کرو اور سٹوڈیو سے

نکال دو۔"

سیٹھ لدھبری کو کھینچ گھسیٹ کر لے گیا۔ کوٹھی میں پہنچ کر اس نے اپنی کار بھیجی اور منگو دادا کو ایکسٹرا یونین کے دفتر سے بلا لیا۔ میں اس وقت سٹوڈیو کے دروازے کے باہر کھڑا تھا مجھے سٹوڈیو کے باہر کھڑا تھا۔ مجھے سٹوڈیو کے اندر داخل ہونے کی اب اجازت نہ تھی۔۔ فوراً ہی سیٹھ کا حکم نامہ پہنچ جانے سے سٹوڈیو کے انچارج نے آنکھیں پھیر لیں تھیں۔ میرا کچھ سامان پڑا تھا سٹوڈیو کے اندر۔ سٹوڈیو انچارج نے ایک لائٹ مین سے کہا تھا کہ وہ مجھے اندر سے میرا سامان لا دے۔ منگو دادا مجھے اسی وقت ایکسٹرا یونین آفس میں لے آیا

"اور سالا روپ کار بابو۔ اپن کا تم

نے خانہ خراب کر دیا۔ اپن نے تم کو

اس لئے چانس نہیں دلایا تھا کہ تم

سیٹھانی سنگ رنگ رلیاں مناؤ۔"

اور میں نے دادا کو غالب کا شعر سنا دیا۔

عشق پر زور نہیں۔ ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور منگو دادا بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔

"ارے ناہیں ناہیں بانکے بابو۔
ایسا ناہیں۔ عسک بازی کرنے
کو ادھر اور بہت لونڈیا اپن سمجھ
گیا۔ تمہارا اسکیم کھولتا۔ اپن تمہارا
بندوبست کرے گا۔ سیٹھانی کا
کھیال دل سے نکال دو۔"

میں نے منگو دادا کا مشورہ ٹھنڈے دل سے سنا۔ لیکن کدمبری کا خیال میرے دل سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ میں اس کو کیسے بھول سکتا تھا لیکن مجھے منگو دادا کی عزت و آبرو کا بھی خیال تھا۔ سیٹھ ڈھل بھائی کے سٹوڈیو میں مجھے اس نے ہی نوکر کرایا تھا۔ ہیرو کا چانس ملنے کی جو صورت نکل آئی تھی وہ منگو دادا کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھی۔ منگو دادا اس معاملے میں میری طرف داری نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے مجھے صاف صاف کہا۔

"دیکھو روپ کمار بابو۔ اپن موالی ہے۔
مرنے مارنے سے نہیں ڈرتا۔ کوئی اور ہوتا
تو اپن اس کو اُسی وخت گھڑیچ کر دیتا۔
پر تم اپن کے گورو دیو کا دوست یار بیلی
اپن تم کو ہاتھ نہیں لگائیں گا۔ پر تم کو بھی
ذری کھیال کرنا پڑتا۔ سیٹھ سے اپن ہزاروں
روپے کماتا۔ اپن اس معاملے میں تمہاری
طرپھداری کریں گا تو سیٹھ خفا ہو جائیں گا۔
تو سیٹھ خفا ہو جائیں گا۔ اپنے سٹوڈیو میں
گھسنے نہیں دے گا۔ اپن کا ہزاروں روپے
کا آمدنی مارا جائیں گا۔"

منگو دادا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ سیٹھ وٹھیل بھائی سٹوڈیو سے سینکڑوں روپے کما رہا تھا۔ اگر وہ اس معاملے میں میری حمایت کرتا تو سیٹھ اُس سے ناراض ہو جاتا۔ اس کو اور اس کے ایکسٹروں کی لام ڈوری کو کبھی اپنے سٹوڈیو میں نہ گھسنے دیتا۔ میں منگو دادا کا بڑا احترام کرتا تھا۔ میں اس کا احسان مند تھا۔ اس

نے مجھے میری منزل پر پہنچانے کے لئے ایک سیڑھی بنائی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ میں ایک لونڈیا سے عشق کرتے ہوئے پہلی سیڑھی ہی سے پھسل گیا تھا۔ میں نے اپنے دل پر صبر کا پتھر رکھ لیا۔ عشق کی آگ اگر بجھا نہ سکا تو اُسے دبانا ہی پڑا۔ اور کوبری نے بھی کسی نہ کسی طرح عشق کی آگ کو دبا ہی لیا۔

منگو دادا نے مجھے ایکسٹرا یونین کے دفتر ہی میں رہنے کو ایک کمرہ دے دیا۔ فلمی صنعت میں خام مال نہ ہونے کی وجہ سے بحران بدستور جاری تھا۔ دادا کے پاس مال تھا تھا۔ وہ جہاں تک ہو سکتا تھا اپنی جان پہچان کے ایکسٹرا لڑکے لڑکیوں کی مدد کر رہا تھا۔ اور پھر میرا بوجھ بھی اس کے کندھوں پر آن پڑا لیکن منگو دادا نے مجھے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس کے کندھوں پر بوجھ ہوں۔ وہ ہر وقت مجھے تسلی دلاسہ دیتا رہتا تھا کہ سٹوڈیو پھر سے چالو ہو جائیں۔ کام ہونے لگے۔ میں تمہیں پھر کہیں نہ کہیں چانس دلا کر دوں گا۔

اسی اثنا میں ایک دن ایکسٹرا یونین میں سندھی سیٹھ چھیدی لال آ گیا۔ وہ بلیو فلمیں بناتا تھا۔ اس کو ایک بلیو فلم کے لیے ایک خوبرو لونڈے اور تین چار ایکسٹرا لونڈیوں کی ضرورت تھی۔ منگو دادا نے مجھے اس کے سامنے پیش کیا۔ تو سیٹھ چھیدی لال خوش ہو گیا۔ بولا!

"دادا اس کو کل صبح میرے دفتر میں بھیج دینا - اور چار فونڈیاں - کوئی اچھی سی۔"

بلیو فلم

بلیو پرنٹ

میں خوش تھا کہ چلو کچھ نہ کچھ کام تو نکلا۔ ہلچل تو پیدا ہوئی۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ بلیو فلم کسے کہتے ہیں۔ اور نہ دادا نے مجھے بتایا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ بلیو فلم کا نام سن کر منگو دادا مسکرایا تھا۔ بار بار مسکرایا تھا۔ دوسرے دن دادا نے مجھے چار ایکسٹرا لونڈیوں کے ساتھ سیٹھ چھیدی مل کے دفتر کی طرف روانہ کر دیا۔ ہم یہ فاصلہ ٹرام میں طے کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بیٹھی چاروں ایکسٹرا لڑکیاں آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے بلیو فلم ہی کی باتیں کر رہی تھیں اور بار بار مسکرا رہی تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بلیو فلموں میں کام کر چکی تھیں۔ وہ بلیو فلموں کے متعلق بہت کچھ جانتی تھیں۔

ہم لوگ سیٹھ چھیدی لال کے دفتر میں پہنچے تو سیٹھ نے ہماری چائے سے تواضع کی۔ اور پھر سیٹھ مجھ کو ایک طرف لے کر بیٹھ گیا۔ باتیں کرنے لگا۔

"دیکھو بابو تم کو بلیو فلم میں کام کرنا ہے۔"

"بلیو فلم کیا؟" میں نے سیٹھ سے پوچھا۔

"تم کو سب کپڑے اتار کر کام کرنا پڑے گا اس فلم میں۔"

"سب کپڑے" میں چونک گیا۔

"ہاں۔ بالکل ننگے ہو کر۔" سیٹھ بولا۔

"یہ تو بڑی شرم کی بات ہے سیٹھ جی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ شرم کیسی۔ اُدھر ولائیت میں ایسی نائٹ کلبیں جہاں عورت مرد ننگے ناچتے گاتے ہیں۔ یورپ میں تو ننگے رہنا فیشن بنتا جا رہا ہے۔ انسان ننگا جنم لیتا ہے۔ جب انسان جنگل میں تھا بالکل ننگا تھا۔ ولایت میں آج کل نیوڈازم کا پرچار ہو رہا ہے۔"

"مگر سیٹھ اپنے دیس میں تو ننگا رہنا تہذیب کے خلاف بات ہے۔ جنگلی

لوگ ننگے رہتے ہیں۔"

"ارے نہیں بابو۔ یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ پرانے زمانے کی باتیں نہ کرو۔"

"اُس بلیو فلم کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نمبر ٹو شش عرف کوک شاستر" سیٹھ نے کہا۔

"نام تو بڑا بیہودہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں۔ نہیں۔ بکدم اچھا نام۔ پنڈت کوکا اس فلم میں زندہ ہو جائے گا۔" سیٹھ نے کہا۔

"پر ایسی فلمیں ہماری تہذیب، ہمارے کلچر، ہماری معاشرت، ہماری سوسائٹی کو مار دیں گی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو بابو۔ اپن کو اپدیس نہ دو۔ اپن بزنس میں ہے۔ بزنس کرتا ہے۔"

"پر سیٹھ تم ننگی فلموں کا بزنس کیوں کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بابو دوسری فلموں میں کیا رکھا ہے۔ تین چار لاکھ روپیہ خرچ کرو۔ کچھ پتہ نہیں پاس ہو فیل ہو۔"

"بزنس میں رسک بھی تو لینا پڑتا ہے سیٹھ۔"

"اپن رسک نہیں لیتا۔ بلیو فلم کوئی فیل نہیں ہوتی۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ اس میں سیٹھ بھی خوش۔ آرٹسٹ لوگ بھی خوش۔"

"ایسی فلمیں بکتی کہاں ہیں سیٹھ؟"

"ادھر حمام سٹریٹ اور کالبادیوی روڈ
پر بہت سے اپنے بھائی لوگ ہیں جو ہاتھوں
ہاتھ ایسی فلم کا پرنٹ اٹھا کرے جاتا۔
ایسا پرنٹ بلیو پرنٹ کہلاتا۔"

"ایسی فلموں کے اور کوئی سوداگر بتاؤ؟"

"بڑے بڑے سیٹھ۔ دولت والے لوگ۔ راجے مہاراجے۔"

"کتنے میں بک جاتا ہے بلیو پرنٹ۔"

"اپن تو راجوں مہاراجوں سے پچاس ہزار بھی لے لیتا ہے
ایک پرنٹ کا۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ اب تو معمولی لوگوں میں بھی ایسے گاہک پیدا
ہو گئے ہیں۔ جو دلالوں کو بلیو فلم اور پروجیکٹ کمیشن پر
دیتے ہیں۔ وہ لوگ سارے بمبئی میں اِدھر سے اُدھر
گھومتے ہیں۔ اور جہاں کہیں کوئی خاص جگہ دیکھتے

ہیں۔ سو لوگوں کو فلم چلا کر دکھاتے ہیں"۔

"ایسے لوگوں کو پولیس نہیں پکڑتی؟"

"پکڑتی کیوں نہیں۔ ایسی فلمیں ایسی جگہوں پر دکھائی جاتی ہیں جہاں پولیس نہیں ہوتی۔ اور اگر پولیس آجائے تو انہیں ادھر اُدھر ہوجانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے"۔ سیٹھ نے جواب دیا۔

"ایسی فلمیں بمبئی میں سب سے زیادہ کون بناتا ہے سیٹھ؟" میں نے پوچھا۔

"میں"۔ سیٹھ نے بڑے فخر سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میری بلیو فلمیں گولڈن جوبلی مناتی ہیں"۔

"کیا یہ فلمیں خاموش ہوتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اور تا کی بھی۔ ان میں ڈانس، گیت اور ڈائیلاگ ہوتے ہیں"۔ سیٹھ نے کہا۔

"یہ فلم کتنی لمبی ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دو ہزار فٹ۔ دو ریل"۔ سیٹھ نے کہا۔

"لڑکیوں کو ایسی فلموں میں کام کرتے شرم نہیں آتی؟" میں نے پوچھا۔

"شرم کریں تو بھوکی مر جائیں۔ ان فلموں

میں زیادہ وہ ایکسٹرا لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ جو بھوکی مرتی ہیں۔ جن کو فلموں میں کام نہیں ملتا۔"

"اچھا تو سیٹھ اب تم ایسی پکچر بناؤ۔"

"کیسی؟"

"جس کو دیکھ کر فلم پروڈیوسر کوئی ایسا اچھا پروگرام بنائیں جس سے کوئی ایکسٹرا لڑکی بیکار نہ رہے۔ بھوکی نہ مرے۔ محض پیٹ کی خاطر ننگی ہو جانے پر مجبور ہو کر ننگی فلموں میں کام نہ کرے۔"

"چھی چھی چھی۔" سیٹھ جھنجلا کر بولا۔

"تم کیا ہمارے دشمن ہو۔ ہمارا بزنس بند کرنا چاہتے ہو۔ ایکسٹرا لڑکیوں کو پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو ملے گا۔ تو بلیو فلموں کے لئے ہم کو لڑکیاں کہاں سے ملے گا۔"

"سیٹھ تم کو بلیو فلم اچھی لگتی ہے یا کسی لڑکی کی عزت؟"

"ہم بزنس مین ہے۔ ہمارے لئے بلیو فلم اچھا ہے۔"

"بلیو فلم میں ہیرو، ہیروئن بھی ہوتے ہیں سیٹھ؟"

"ہوتے ہیں۔"

"تمہاری پہلی بلیو فلموں کی لاجواب ہیروئن کون ہے؟"

"ماہ پارا ۔ لاجواب کام کرتی ہے جواب
نہیں اس کے آرٹ کا۔"

"کیا ننگے ہو جانا بھی آرٹ ہے سیٹھ؟"

"ایک بہت بڑا آرٹ۔"

"اور ایسی فلمیں بنانا؟"

"وہ بھی ایک بہت بڑا آرٹ۔"

"اور ایسی فلمیں بنانے والا؟"

"وہ بھی ایک بہت بڑا آرٹسٹ۔"

"بس تو پھر تم بھی کسی بلیو فلم میں کام کرو سیٹھ۔"

"نہیں ۔ نہیں ۔ اپن تو ڈائرکٹر ہے۔"

"تو کیا ڈائرکٹر میں آرٹ نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے ۔ اپن اب آرٹ کی بڑی اونچی ڈگری میں فٹ کی طرح پورا فٹ ہے ۔ جہاں اپن ننگا نہیں ہو سکتا۔"

"سیٹھ تم ایسی فلمیں تیار کہاں کرتے ہو؟"

"اپنے خفیہ سٹوڈیو میں۔"

"اس سٹوڈیو پر پولیس نے کبھی چھاپہ نہیں مارا؟"

"اپن ہر فلم پر اپنا سٹوڈیو بدلتا رہتا ہے۔"

"اور جو تمہارے سٹاف کا کوئی آرٹسٹ مخبری کر دے؟"

"اپن سٹاف بھی بدلتا رہتا ہے۔ جب اپن فلم بناتا ہے۔ یونٹ کو ادھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ کیمرا مین۔ اس کا اسسٹنٹ۔ ہیرو۔ ہیروئن۔ اور فلم میں کام کرنے والے دوسرے سب لوگوں کو قید کر دیتا ہے۔ سات دن تک کوئی اپنے گھر نہیں جا سکتا۔ ٹیلی فون نہیں کر سکتا۔ خط نہیں لکھ سکتا۔ ٹٹی پیشاب خانہ واشر سب اندر۔"

"بس تو سیٹھ تم بڑے وہ ہو۔"

"وہ کیا؟"

"بلیو برڈ۔"

یہ سن کر سیٹھ نے ایک قہقہہ مارا۔ بولا۔

"ہم تم کو ایک ہزار روپیہ دے گا۔ سو روپیہ ابھی ایڈوانس لے جاؤ۔"

"اور یہ لڑکیاں؟"

"ہم ان کو فی لڑکی پانچ سو سے زیادہ نہیں دے گا۔"

"یہ لڑکیاں اس فلم میں کیا کچھ کریں گی سیٹھ؟"

"یہ کچھ نہیں کریں گی ان کے ساتھ بہت کچھ کیا جائے گا۔"

"ایسا کرنے والا کون ہو گا۔؟"

"تم۔"

"میں؟"

"ایک اور جوان بھی ہو گا۔"

"وہ کون؟"

"ہے ایک گھوڑی سانڈ۔"

"میں تمہاری فلم میں کام نہیں کروں گا سیٹھ۔"

"کیوں سکیا بات ہے؟"

"میں بلیو اینجل سے بہت ڈرتا ہوں۔"

"وہ کون؟"

"نیلا فرشتہ۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"نیلے نیلے آسمان پر۔"

"وہ زمین پر کیسے آئے گا؟"

"جیسے بارش کا قطرہ زمین پر آتا ہے۔ جیسے سورج اور چاند کی

"روشنی زمین پہ آتی ہے۔"

اور میں اٹھ کر چلا آیا۔ منگو دادا نے پوچھا "ہو گیا کنٹریکٹ؟"

"نہیں دادا" میں نے جواب دیا۔

"کیوں کیا بات؟" دادا نے پوچھا۔

"میں کسی لڑکی سے پیار کر سکتا ہوں اُسے ننگا نہیں کر سکتا۔"

دادا مسکرایا۔ بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔

"اچھا عشق بازی - کرو ضرور کرو۔ پر اپن تم کو سیٹھ مٹھل کی بیوی کد میری سے نہیں کرنے دیں گا۔ تمہارا سسٹم نکالنے کا کوئی انتجام کرے گا۔"

○

اندھیرا اُجالا

سٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ کبھی اندھیرا کبھی اُجالا!!

"بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ"

"لائٹس آن۔ لائٹس آف"

"چودہ نمبر اوپر لو"

"ستائیس نمبر کو ہارڈ کرو"

"ہارڈ —— اور ہارڈ — بس بس۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ بس"

"نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو"

"نہیں نہیں۔ شیشے کا"

"مس ساوتری کو ایک بے بی اور دو"

بے بی سٹوڈیو میں سیٹ پر جلنے والی ایک بتی کا نام ہے۔ یہاں بے بی سے مراد بچہ نہیں۔

"ریہرسل"

"کیمرہ ریڈی فار ریہرسل"

"یس ریڈی۔ او۔ کے"

"آل لائٹس"

اندھیرے کے سمندر میں بہت سی بتیاں جگمگانے لگیں۔ بہت سے سورج۔

"ریہرسل"

"خاموش۔ خاموش" ساونڈ ٹرک کی سیٹی کی آواز۔

"یس مس شکنتلا۔ ریڈی ارون کمار" یہ ڈائرکٹر کی آواز تھی۔ اور ایور ریڈی بلیڈ کی طرح تیز تھی۔

"ساونڈ ریہرسل"

ہیرو اور ہیروئن ڈائیلاگ بولنے لگے۔

"کیا تم سچ مچ مجھ سے پریم کرتی ہو رجنی؟"

"ہاں سندر"

"تم کو مجھ سے کتنا پریم ہے؟"

"جتنا سمندر میں پانی ہے"

"اچھا"

"ہاں ــ اور تم کو مجھ سے کتنا پیار ہے؟"

"جتنی پھولوں میں خوشبو ہے"

"رجنی"

"سندر"

"ہاؤ از اِیٹ؟" یہ ڈائرکٹر کی آواز تھی۔

فیڈ فیڈ۔ ساؤنڈ ٹرک سے دو سیٹیاں ــ او ــ کے!!

"لائٹس آف" یہ کیمرہ مین کی آواز تھی۔

"ریڈی فار ٹیک" یہ ڈائرکٹر کی آواز تھی۔

اتنے میں اُدھر سے اسسٹنٹ کیمرہ مین کی آواز آئی۔

"میک اپ ماسٹر"

"یس سر" میک اپ ماسٹر جلدی سے آگے ہُوا۔

"مس رجنی کی لپ اسٹک ٹھیک کرو" اسسٹنٹ کیمرہ مین

نے کہا۔

"ارون کمار کی ناک چمک رہی ہے۔" ڈائرکٹر نے کہا۔

"پف مارو ناک پر۔"

"یس سر" میک اپ ماسٹر بولا۔

"یس سر کا بچہ۔ میک اپ اچھا نہیں کرتا۔" ڈائرکٹر نے کہا۔

"صاحب میں کیا کروں۔ میک اپ کراتے ہوئے ہیرو صاحب نخرے بڑے کرتا ہے۔" میک اپ ماسٹر نے کہا۔

"اچھا۔ ہم اس کو ابھی ٹھیک کرے گا۔" ڈائرکٹر بولا۔

"ریڈی فار ٹیک۔"

"اوکے۔"

"فوکس۔"

"چار فٹ دس انچ۔"

"لینز بدلو۔ ففٹی ٹو لگاؤ۔"

"ساؤنڈ ریڈی۔"

اور اتنے میں سٹوڈیو کی چھت میں بیٹھے ہوئے دو کبوتر بول پڑے۔

"خاموش۔ خاموش۔ وی آر شوٹنگ۔"

"فل لائٹس۔"

سوئی ہوئی فلمی دنیا پھر جاگ پڑی تھی۔ صنعتی بحران ختم ہو رہا تھا۔ رکی ہوئی فلمیں پھر چالو ہو گئیں تھیں۔ ہر سٹوڈیو میں چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔

سروج مووی ٹون کا سیٹھ سونا مل چاندی مل زیر تکمیل فلم کے ساتھ ہی ایک اور فلم شروع کرنے والا تھا۔ نئے چہروں کی ضرورت تھی۔ نامور فلم اسٹار لاکھ لاکھ دو دو لاکھ مانگ رہے تھے۔ اتنا عرصہ بیکار رہنے کی کسر نکالنا چاہتے تھے۔ سیٹھ نے فلمی بجٹ میں بچت کے خیال سے نئے چہروں کی بھرتی کا اعلان کر دیا تھا۔ منگو دادا مجھے ساتھ لے کر رنجیت سٹوڈیو میں چلا آیا تھا۔ سیٹھ سونا مل چاندی مل مجھے دیکھنا چاہتا تھا۔ سیٹھ ابھی گھر سے نہیں آیا تھا۔ دادا مجھے سٹوڈیو میں لے آیا تھا کہ چلو تب تک شوٹنگ دیکھتے ہیں۔ وہ دونوں سٹوڈیو کے ایک کونے میں لگے کھڑے تھے۔

شاٹ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن ڈائرکٹر ابھی یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ کہ شاٹ کو اوکے کہے یا این جی۔ وہ اس شاٹ میں کوئی پکٹوریل الیفکٹ چاہتا تھا۔

"ہم بولتا چندو بھائی کوئی پکٹوریل الیفکٹ"

"نمبر ۲،۷ آن کرو" کیمرہ مین نے نمبر ۲،۷ کے لائٹ مین کو آواز دی۔

"نمبر چودہ کو ہارڈ کرو۔"

"سولر کو ذرا نیچے کرو۔"

"اور یہ دو بے بی یہاں سے ہٹا لو۔ اور یہ نمبر ۱۴ کو اپر لو۔" ڈائرکٹر نے ہدایت دی۔

"وہ تو ٹھیک ہے صاحب۔ پر اتنے اونچے سے صرف ایک لائٹ دیں گا تو پکچر ایک دم ڈارک ہو جائیں گا۔ کم سے کم دو سپاٹ دو بے بیز۔"

"نو۔ نو۔ چندو بھائی اپنے کو ادھر ایک لائٹ سرکل مانگتا۔ کیمرہ کرین پر اوپر لانگ شاٹ میں جائیں گا۔ سرکل میں ہیروئن کھڑی ہو گا۔ یکدم اوپر دیکھیں گا۔" ڈائرکٹر نے کہا۔

"پر راجو صاحب تیس فٹ سے لائٹ ماریں گا تو سرکل بڑا بنے گا۔ لائٹ بڑا ڈفیوز ہو گا۔ کچھ رجسٹر نہ ہو گا۔" کیمرا مین چندو بھائی نے کہا۔

"او نو۔ نو۔ اپن نہ مانیں۔ تم کیمرہ مین ہے کوئی انٹی شنٹی لڑاؤ۔" ڈائرکٹر نے کہا۔

"اچھا تو اپن ادھر ایک اور سولر لیں گا۔" چندو بھائی نے کہا۔

"ٹھیک ہے بڑا شوندر شاٹ ہو گا۔" ڈائرکٹر راجو نے کہا۔

"ارے نا ہیں نا ہیں۔ یہ کیا شوندر وندر بولتا پڑا۔ یو ڈیم۔" یہ

سیٹھ جی کی آواز تھی۔ جو سٹوڈیو میں پیچھے سے داخل ہو کر کیمرے کے قریب آ گئے تھے

"اپن کا پکچر بڑا لیٹ ہوں گیا ہے۔ تم برو بر میں ٹیک ٹیک کرتا ہے۔ اپن کا پیسہ حرام کا ہیں۔ جلدی پکچر ختم کرو۔ نا ہیں تو اپن تم سب کو ختم کر دے گا" سیٹھ جی غصے میں گرج چمک رہے تھے۔

سٹوڈیو کی دنیا میں سیٹھ خدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں سیٹھ کا ہر قانون اٹل ہے۔ اس کا ہر حکم فوراً مانا جاتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بول نہیں سکتا ہے وہ سب کا مالک ہوتا ہے۔ ان داتا ہوتا ہے۔ سب لوگ جلدی جلدی کام کرنے لگے۔

"لائٹ آن" یہ کیمرہ مین کی آواز تھی۔

"ساؤنڈ ریہرسل"

"ساؤنڈ سٹارٹ" یہ ڈائرکٹر راجو کی آواز تھی۔

فئی فئی ــــ!! ساؤنڈ ٹرک سے دو سیٹیاں۔

"کیمرہ"!

"کلیپ"ــــ

کیمرہ کرین پر تھا۔ آہستہ آہستہ ہیروئین کے کلوز اپ سے پیچھے اور اونچا ہوتا چلا گیا۔ اور سیٹھ سونا مل چاندی مل سب کو ڈانٹ

پلا کر اپنے آفس میں آ بیٹھا۔ جہاں سیٹھ کی نئی پکچر "پیار کی دنیا" کا مصنف منشی پنچھی سیٹھ کے انتظار میں بیڑی جلائے بیٹھا تھا اور اس کا دھواں پھانک رہا تھا صبح سے اُس نے چائے نہ چاکھی تھی اور اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سیٹھ آئے گا۔ تو چائے آئے گی۔

سیٹھ سونا مل چاندی مل اپنی نئی فلم "پیار کی دنیا" کی مہورت سے پہلے تمام چوٹی کے ستاروں کو انٹرویو کے لئے بلانا چاہتا تھا۔ تاکہ ان میں سے ایک کو ہیرو چنے۔ دفتر میں آتے ہی سیٹھ نے منشی پنچھی سے کہا۔

"منشی جی۔ اپن فلم اسٹاروں کا نام بولیں گا۔ تم سالا سوچ کر بتاؤ اپن کی نئی فلم کونسا چلے گا؟"

یہ کہتے ہی سیٹھ نے اپنا پورٹ فولیو کھولا۔ کاغذ کا ایک لمبا سا ٹکڑا اور چوٹی کے فلم اسٹاروں کے نام پڑھنے لگا۔

"نمبر ایک —— اشوک کمار" سیٹھ نے پہلا نام بولا۔

"نہیں چلیں گا۔ زنخا ہوتا جا رہا ہے۔ نخرے زیادہ ایکٹنگ کم کرتا ہے"

"نمبر دو —— موتی لال"

لعنت بھیجو اُس پر سیٹھ۔ گنجا ہے۔ پکچر میں گڑبڑ ہو جائیں گا۔

"نمبر تین ——— کرن دیوان"

"وہ تو بالکل کباڑ خانہ ہے"

"نمبر چار ——— شیخ مختار"

"بڑا کمال کا ایکٹر ہے۔ پر کنگ کانگ ہے۔ ہیروئن ڈریں گا۔ پکچر ڈبہ ہو جائیں گا"

"نمبر پانچ ——— سریندر"

"وہ تو سیٹھ سُر میں نہیں ہے۔ بڑا بے سُرا گاتا ہے"

"نمبر چھ ——— جنیت"

"چھی چھی چھی۔ وہ بھی کوئی ایکٹر ہے۔ وہ تو پاسنگ شو کی ڈبی ہے"

"نمبر سات ——— واسطی"

"اس کو تو خدا کے واسطے سیٹھ تم اپنی پکچر میں لینا ہی مت۔ تمہاری پکچر کو لے کر بیٹھ جائے گا۔ وہ ایکٹر نہیں اَوٹ پٹانگ ہے"

"نمبر آٹھ ——— سدرشن"

"وہ تو سادھو ہے سیٹھ جی"

"منشی جی تم نے تو ہر ہیرو کو ناپاس کر دیا" سیٹھ جی نے کہا۔

"جی سیٹھ جی۔ نئی پکچر میں نیا ہیرو لو" منشی جی نے کہا۔

"اپن کا بھی یہی خیال ہے۔" سیٹھ جی نے صندلی بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

"نئی کہانی نیا ہیرو۔"

"اور ہیروئن کونسی سیٹھ جی؟" منشی پنچھی نے پوچھا۔

"ہیروئن مس رمبھا۔" سیٹھ جی نے جواب دیا۔

"نمستے سیٹھ جی نمستے۔" یہ آواز کمرے میں سنائی دی تو سیٹھ جی نے جلدی سے سامنے دیکھا۔

منگو دادا مجھے ساتھ لئے دروازے سے آگے نکل آیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو پہلے چپڑاسی کو اندر بھیجتا سیٹھ جی کے ساتھ ملاقات کی اجازت کے لئے۔ لیکن منگو دادا کو کھلی چھٹی تھی۔ وہ بغیر اجازت کے ملاقات کے لئے۔ سیٹھ کے کمرے میں داخل ہو سکتا تھا۔

"آؤ دادا آؤ۔" سیٹھ نے کہا۔ "کیسے آیا؟"

"سیٹھ جی آپ سے ایک عرج کرنی ہے۔" منگو دادا نے کہا۔

"کہو دادا کہو۔ اپن غور سے سن رہیا۔" سیٹھ نے صندلی بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو دادا بیٹھو۔"

منگو دادا کرسی پر بیٹھ گیا۔ بازو سے پکڑ کر مجھے بھی کرسی پر بٹھا دیا۔ بولا ــــــ

"سیٹھ جی - یہ اپن کے پاس فس کلاس ہیرو ہے - بڑا بانکا - بڑا شوندر - ایسا ہیرو سیٹھ جی تم نے کبھی ناہیں دیکھا ہو گا۔"

یہ سنتے ہی سیٹھ جی نے مجھے کیمرے کی نظر سے بڑے غور سے دیکھا - اور پھر گردن گھماتے ہوئے منشی پنچھی کو اشارہ کیا ذرا سی گردن ہلا کر آنکھ مارتے ہوئے کہ بہت اچھا ہے - پھر منشی پنچھی نے اپنی عینک کے شیشوں میں سے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے سیٹھ جی کی تائید کی۔

"اچھا دادا اپن بولتا اس کو بولو کل ٹھیک دس بجے ادھر دفتر میں پہنچ جائے - اپن سوچے گا جواب دیں گا" سیٹھ جی نے کہا۔

اتنے میں بیرا چائے لے آیا تو ہم سب چائے پینے لگے۔ سیٹھ مظفر علی بیڑیاں پینے لگا۔

انٹرویو

یعنی

انٹرول سے آگے

وہ رات میں نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ صبح ہوئی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر میں سیٹھ سونا مل چاندی مل کے آفس میں پہنچنے کے لئے ایکسٹرا ونین کی عمارت سے نکلا۔ سڑک پر چند لڑکیاں ٹوٹے ہوئے چپل پہنے آپس میں ٹھٹھا مخول کرتے ہوئے رنجیت سٹوڈیو سے نکلیں اور شری ساؤنڈ سٹوڈیو کی طرف چلی گئیں۔ ایک پروڈیوسر کی نیو ماڈل فیئٹ فراٹے بھرتے ہوئے میرے پاس سے گزر گئی۔ فٹ پاتھ پر ایک کتا ایک کتیا کے ساتھ صبح صبح ہی رومانٹک ہو چلا تھا۔

منشی پنچھی جی موٹے شیشوں کی عینک لگائے کاغذوں کا پلندہ دبائے ایرانی ہوٹل میں چائے پی کر نکلے اور پھر بیڑی پیتے ہوئے امر سٹوڈیو کی طرف چل دیئے ۔ ایک مشہور ہیروئن کی پلائی ماتھ ایوننگ ان پیریس کی خوشبو بکھیرتی ہوئی سڑک پر سے گزر گئی ۔ دادر مین روڈ پر جس کو ہندوستان کا ہالی وڈ کہا جاتا ہے ۔ اس وقت بڑی چہل پہل ہو رہی تھی ۔

میں دس بجے سے پہلے ہی سیٹھ سونا مل چاندی مل کے دفتر کے سامنے خالی میز پر جا کر بیٹھ گیا ۔ سٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں حسب معمول خوب چہل پہل تھی ۔ ستارا مووی ٹون کی پنجابی فلم "گلی ڈنڈا" کی شوٹنگ کا بورڈ چھ بجے کا لگا ہوا تھا ۔ فلم کا ڈائرکٹر بھاٹیہ بے چینی میں ادھر اُدھر چکر لگا رہا تھا ۔ اس کی ہیروئن مس گلبدن ابھی تک نہیں آئی تھی ۔ کام رکا ہوا تھا ۔ پیپل کے پیڑ تلے دو اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ایک اسسٹنٹ کیمرہ مین کھڑے چند ایکسٹرا لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ رہے تھے ۔

دو آدھی ننگی گھاٹنیں بھاری بھاری لائٹوں کو سٹوڈیو نمبر ایک سے اٹھا کر سٹوڈیو نمبر دو میں لے جا رہی تھیں ۔ بمبئی میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ قلیوں اور مزدوروں کا کام کرتی ہیں ۔ گھاٹنوں کے بدن چکنے سانولے اور گھٹے ہوئے تھے ۔

اور ایک پتلا دبلا پیلی رنگت کا لائٹ مین اُن مزدور عورتوں کی

سڈول ٹانگوں اور ان کے کولہوں کے ابھار کی خیالی ڈرائینگ کر رہا تھا۔ ٹکٹکی لگائے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایکسٹرا گھاٹن رہ رہ کر اپنے سینے کے ابھار کو کھجا رہی تھی۔

دس بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ ستارا موودی ٹون کی فلم "گلی ڈنڈا" کی ہیروئن مس گلبدن اپنی ماسٹر بیوک پر سٹوڈیو میں وارد ہوئی۔ ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے دوڑ کر کار کا دروازہ کھولا۔ دوسرے نے مس گلبدن کا میک اپ بکس سنبھالا۔ خود ڈائرکٹر بھائیہ اپنی ہیروئن کو گڈ مارننگ کرنے آگے ہوا تو مس گلبدن کی بوڑھی ماں نے اُسے اپنا پاندان تھما دیا۔ بڑھیا کا نام تھا بدر بائی۔ اس نے اپنے پوپلے بن دانتوں کے منہ سے بھائیہ کو تین چار سنائیں۔ کیونکہ پبلسٹی مینیجر نے گلبدن کا نام کسی اشتہار میں ہیرو کے بعد لکھ دیا تھا۔ خطا پبلسٹی مینیجر کی اور گالیاں کھا رہا تھا بھائیہ۔

گلبدن کی ماں بدر بائی کسی زمانے میں دہلی میں چاوڑی میں بیٹھتی تھی۔ گانا بجانا کرتی تھی۔ وہاں اس کی کنٹی نیوٹی ایک سیٹھ سے مل گئی جو اُسے بمبئی لے آیا۔ اور گھر میں ڈال لیا۔ لیکن اچانک سیٹھ جی ایک دن سورگ باس ہو گئے تو ان کے رشتہ دار بدر بائی سے یکدم فرنٹ ہو گئے۔ بدر بائی فارس روڈ پر آ بیٹھی۔ گانا بجانا کرنے لگی۔ گلبدن بھی وہیں پروان چڑھی

شکل و صورت اچھی تھی۔ ہیروئن کا چانس مل گیا۔ اس کی پہلی پکچر "چاندنی چوک" تھی جو ہٹ گئی۔ دوسری پکچر تھی "جوڑ توڑ"۔ جس نے فلم انڈسٹری کے سب سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے تو مس گلبدن چوٹی کی ہیروئن بن گئی۔

کار سے اتر کر مس گلبدن میک اپ روم میں چلی گئی۔ جلدی جلدی میک اپ کر کے آدھے گھنٹے میں کمرے سے باہر نکلی تو پہلے سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سٹوڈیو کی پوشاک پہن لی تھی۔ گھگھرے چولی میں وہ سلولائڈ کی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چھم چھم کرتی سٹوڈیو نمبر ۲ کی طرف چلی گئی۔

پوم پوم۔۔۔ پوم پوم!!!

ایکا ایکی موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ تو سیٹھ جی کی کار سٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ جو لوگ چل رہے تھے رک گئے۔ جو بیٹھے تھے ادب سے چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

باادب باملاحظہ ہوشیار۔ شہنشاہِ عالم کی سواری آتی ہے۔ میں بھی جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بھئی واہ کیا ٹھاٹھ تھے سیٹھ سونا مل چاندی مل کے۔ موتیا رنگ کا ریشمی کوٹ جس میں ہیرے اور سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ سفید دھوتی اور کالی ٹوپی۔ پاؤں میں کالے رنگ کے پیٹنٹ شو۔ اپنے آفس کے پاس

انہوں نے پان کی پیک تھوکی۔ بغیر اِدھر اُدھر دیکھے سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے کمرے سے کلرک اور چپڑاسی فائلیں اور خطوط کے پلندے لے کر دوڑے۔ سیٹھ جی نے ایک گرجدار ڈکار ماری اس کے بعد ٹیلی فون کی چرخی گھمانے کی گڑگڑاہٹ۔ سیٹھ جی نے اوپن کلوز سٹہ مارکیٹ میں ٹیلی فون کیا۔ اپنے اسٹاک بروکر سے سٹے کی بات چیت کرنے لگے۔ کوئی کوئی لفظ باہر بھی سنائی دے رہا تھا۔

"تیجی مندی — خریدو — بیچو — پکڑو —
نیویارک کاٹن — ایک سو بیس — کور کورو کور۔"

اتنے میں ایک چپڑاسی کمرے سے باہر آیا تو میں نے روک کر کہا۔

"میرا نام تو اندر پہنچا دو۔"

"کارڈ ہے تمہارے پاس؟" چپڑاسی نے پوچھا۔

"کارڈ تو نہیں ہے۔"

"ہُنھ — یہ لو — نام لکھو۔"

میں نے نام لکھ کر چپڑاسی کو دیا۔ اور پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ کے بعد چپڑاسی آیا۔ اور اس بار کسی قدر کم بدتمیزی سے بولا۔

"بلاتے ہیں سیٹھ جی"

میں اٹھ کر جلدی سے سٹراپ کمرے میں۔ جاتے ہی سیٹھ جی کو ایک فوجی سلوٹ مارا۔ سیٹھ جی مسکرائے۔ بولے

"اپن کو تم بڑا سمارٹ مالم ہوتا"

"چانس مل گیا تو اس سے زیادہ سمارٹ ہو جاؤں گا سیٹھ جی"

میں نے جواب دیا۔

"پڑھا لکھا ہے؟" سیٹھ جی نے سوال کیا۔

"جی میں بی اے ہوں" میں نے جواب دیا۔

"گانا آتا ہے؟"

"گانا اور رونا کس کو نہیں آتا سیٹھ جی"

"ناچنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ٹپ ڈانس بڑا اچھا کرتا ہوں"

"چلو تو ٹپ ڈانس کرو"

"میں نے منہ سے ایک انگلش ٹیون بجاتے ہوئے سیٹھ جی کو ٹپ ڈانس دکھایا"

سیٹھ جی بہت خوش ہوئے۔ بولے۔

"اب گانا سناؤ۔"

"پکا گانا یا ہلکا پھلکا۔"

"کوئی راگ کوئی راگنی سناؤ۔"

"ٹھمری یا خیال۔"

"ٹھمری"

"صبح کا وقت ہے۔ بھیرویں بڑا مزا دے گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

میں نے ٹھمری سنائی۔ سیٹھ جی بڑے خوش ہوئے۔ بولے۔

"اب تم اپن کو ڈائیلاگ سناؤ۔"

اور میں نے مہاکوی کالی داس کے ڈرامے شکنتلا اور میگھ دوت سے ڈائیلاگ سنائے۔ سیٹھ جی بھی پڑھے لکھے۔ ایسے ویسے سیٹھوں کی طرح گھامڑ نہ تھے۔ فنون لطیفہ کے رسیا تھے۔ ڈرامے کا بھی درک تھا۔ بولے

"گھوڑے کا سواری کر سکتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پانی میں تیر سکتا ہے؟"

"جی ہاں"

"تلوار چلا سکتا ہے؟"

"تلوار کیا سیٹھ جی میں تو توپ بھی چلا سکتا ہے"

"کلابازی کر سکتا ہے"

"ضرور کر سکتا ہے"

"جمناسٹک کر سکتا ہے"

"ضرور کر سکتا ہے۔ الٹی سیدھی قلابازی لگانا۔ الٹا لٹک جانا۔ بغیر سیڑھی کے دیوار پر چڑھ جانا۔ دیوار پھاند کر ایک مکان سے دوسرے مکان میں گھس جانا۔ یہ میں کر سکتا ہوں"

"اپن تم کو پہلی پکچر کا پانچ ہزار دے گا"

"اچھا سیٹھ جی"

"دوسری پکچر کا دس ہزار"

"شکریہ سیٹھ"

"اپن نے تم کو اپنی نئی پکچر کا ہیرو رکھ لیا ہے"

"شکریہ سیٹھ جی"

"ارے او روی شنکر۔ روی شنکر" سیٹھ جی نے پروڈکشن انچارج کو آواز دی۔

"جی سیٹھ جی" روی شنکر بھاگ کر کمرے میں داخل ہوا۔

"اس چھوکرا کا کنٹریکٹ بناؤ۔

"کتنے کا سیٹھ جی؟" روی شنکر نے پوچھا۔

"پانچ ہزار کا۔ پانچسو روپیہ ایڈوانس"

"اچھا سیٹھ جی"

"اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جلدی سے کنٹریکٹ سائن کرو۔ ایڈوانس ابھی دے دو"

"اچھا سیٹھ جی"۔ روی شنکر سیٹھ جی کو جواب دے کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"چلو بابو ادھر آؤ"

"بابو نام کیا تمہارا؟" سیٹھ نے مجھ سے پوچھا۔

"روپ کمار" میں نے کہا۔

"تم بھی سندر اور تمہارا نام بھی سندر" سیٹھ نے کہا۔

"اور میں کام بھی بڑا سندر کر کے دکھاؤں گا سیٹھ جی" میں نے کہا۔

سیٹھ جی ہنس دیئے۔ پروڈکشن انچارج روی شنکر بھی ہنس دیا۔ میں بھی ہنسنے لگا۔

شمی کو شاید

اب میں سیٹھ سونا مل چاندی مل کی نئی پکچر "پیار کی دنیا" کا ہیرو تھا اور ہیروئن رمبھا۔ جو اس سے پہلے کئی پکچروں میں کام کر کے نام پیدا کر چکی تھی۔

اس وقت میں سٹوڈیو کے ہوٹل میں اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سامنے ایک درخت کے نیچے گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جس پر ایکسٹرا لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

اس دن ہوٹل میں بڑی بھیڑ ہو رہی تھی۔ ہوٹل سے باہر

بچھی کرسیوں پر دو ایکسٹرا لڑکیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"اچھا تو بومبے ٹاکیز میں تمہارا کام نہیں بنا" یہ آواز چنچل شوخ الھڑ پنجابی تھی۔

"نہیں اگلے ہفتے پھر بلایا ہے" یہ آواز دھیمی اور اداس تھی۔

"بڑی حیرانی کی بات ہے تم منگو دادا کے ساتھ گئیں اور تمہارا کام نہ بنا"

"جب آگے کمپنی والوں کو ضرورت نہ ہو تو دادا کیا کر سکتا ہے"

"یہ تو نہ کہو جس لڑکی سے اس کی بات ہو جائے اس کے لئے تو دادا اپنی جان لڑا دیتا ہے"

"میں دادا کے ساتھ ایسی ویسی بات نہیں کر سکتی"

"تم ابھی نئی نئی ہو۔ جبھی تو ایسی باتیں کرتی ہو"

"میں پوچھتی ہوں سیٹھ جی ایکسٹرا لڑکیوں کا چناؤ کب کریں گے؟"

"اب کیا خبر۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ سیٹھ جی کو ایکسٹرا لڑکیوں کا چناؤ کرنے کی فرصت نہیں ملتی"

"مجھے تو بھوک لگی ہے۔ گھر سے بس ایک پیالی چائے پی کر

چلی تھی۔"

"مجھے بھی بھوک لگی ہے ۔ پر یہاں تو ٹین کے پترے کا باسی توس بھی یہ۔ دو آنے میں ملتا ہے ۔"

"میرے پاس تو دس آنے ہیں ۔ چار آنے واپسی کے لئے چاہئیں"۔

"اور میرے پاس چھ آنے ۔ ٹرام میں بھی گئی تو گھر پہنچنے کے لئے چھ پیسے چاہئیں۔"

تو کوئی بات نہیں ۔ ایک ایک آملیٹ کھا لیتی ہیں۔"

"اے بابو۔"

یہ آواز مجھے دی گئی تھی ساں دونوں ایکسٹرا لڑکیوں میں سے ایک نے مجھے بلایا تھا۔ مجھے مڑ کر دیکھنا ہی پڑا ۔ چنچل اور شوخ آواز والی پنجابن جس نے مجھے پکارا تھا خاصی قبول صورت تھی ۔ اس سے پہلے بھی میں نے اسے ایکسٹرا سپلائر یونین میں ایک بار دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو فیس پوڈر تھا نہ کوئی زیور نہ ساڑھی پھر بھی اس کا قدرتی حسن بڑا دلکش تھا۔

"کیوں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس ہوٹل میں آملیٹ کتنے کا ملتا ہے؟" پنجابن نے پوچھا۔

"میں کوئی اس ہوٹل کا چھوکرا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اجی سرکار بگڑتے کیوں ہو۔ بس اتنا ہی تو پوچھا ہے آملیٹ کتنے کا ملتا ہے" پنجابن نے کہا۔

"بارہ آنے کا"

"باپ رے باپ۔ آملیٹ نہیں ہم تو بس آملیٹ کی خوشبو کھا سکتی ہیں"

"کیوں بہن تمہارا نام کیا ہے؟" وہ پھر آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

"اندرا۔ اور تمہارا؟"

"فیروزہ"

اتنے میں پروڈکشن انچارج روی شنکر آ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

"بابو روپ کمار میں تمہیں دیکھتا پھر رہا ہوں"

"کہو روی بابو کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دس ناچنے والیوں کے گھگھرے سل کر تیار ہو گئے ہیں۔ چیتو مل ڈریس میکر کی دکان سے فون آیا ہے۔ جب تک سب ایکسٹرا لڑکیاں ناپ نہ دیں گی چولیاں تیار نہیں ہو سکتیں۔ اور بابو ڈریس کے لئے تمہارا ابھی ناپ لینا ہے۔ چلو اٹھو"

"چلو بابو" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

سٹوڈیو نمبر ۲ کے سامنے سٹوڈیو ویگن تیار کھڑی تھی۔ اس میں

لڑکیوں کو ٹھونس ٹھانس دیا گیا۔ میں ردی شنکر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ویگن اسٹارٹ ہوئی تو ردی شنکر ایکسٹرا لڑکیوں کی تصویروں کے گڈے سے تاش کے پتوں کی طرح کھیلنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ہم جیتو ڈریس میکر کی دکان پر تھے۔ سیٹھ سونا مل چاندی مل نے اس سے کنٹریکٹ کیا ہوا تھا۔ سیٹھ کی ہر فلم کی کاسٹ کے کاسٹیوم اور ڈریس جیتو ٹیلر ماسٹر ہی بناتا تھا۔ ایکسٹرا لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی چیتا سی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ انچ ٹیپ اور فیتہ پکڑ کر یکدم سپاٹ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

"چھوٹے سیٹھ" جیتو نے ردی شنکر سے کہا۔

"ان لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دو"

"دیکھو ماسٹر صاحب تم پہلے بابو روپ کمار کا ناپ لو سیٹھ جی کی نئی پکچر پیار کی دنیا کے ہیرو"

ردی شنکر سیٹھ سونا مل چاندی مل کا سالا تھا۔ اس لئے اس کو چھوٹے سیٹھ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

"ہیرو بابو۔ منہ میٹھا نہیں کرایا آپ نے۔ موتی چور کے لڈو کھلاؤ نا" جیتو ٹیلر ماسٹر نے کہا۔

"اچھا ماسٹر جی کھلائیں گے۔ کل ضرور" میں نے کہا۔

چیتو ٹیلر ماسٹر نے خوشی خوشی میرا ناپ لیا اور پھر ایکسٹرا لڑکیوں کی لام ڈوری کی طرف ہو گیا۔ مگر صرف ایک ایکسٹرا لڑکی تھی۔ جو اُس لام ڈوری سے باہر کھڑی تھی۔ اس کا نام تھا چاندنی سلا۔ نبے لمبے کالے گھنگھریالے بال۔ کشادہ پیشانی۔ ستواں ناک۔ گھنی۔ خمدار پلکیں ہرن کی سی آنکھیں۔ ابرو کمان۔ ہونٹ انار کی کلیاں۔ دانت جیسے موتی۔ سرخ و سفید رنگ۔ دائیں طرف گال پر ننھا سا تل۔ لمبی گردن۔ ابھرا ہوا سینہ۔ بڑی پتلی کمر۔ ابھرے ہوئے کولہے۔ سر سے پاؤں تک سانچے میں ڈھلی ہوئی۔

میں اس سے پہلے بھی اُسے کئی بار سٹوڈیو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ اکیلی آتی تھی اور اکیلی نہ جانے کہاں چلی جاتی تھی۔ وہ دوسری ایکسٹرا لڑکیوں سے بالکل الگ تھلگ اور چپ چپ رہتی۔ وہ کسی ایکسٹرا سپلائر کے ذریعے نہیں خود بخود سٹوڈیو میں آئی تھی سیٹھ جی نے خود اس کا چناؤ کیا تھا۔

منگو دادا نے ایک دو بار اُسے گانٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ گھڑے مچھلی نہ تھی۔ وہ دادا کے ساتھ بات کرنے سے کتراتی تھی۔ دادا ایک دفعہ اس کے ساتھ داداگیری پر

اتر آیا۔ تو اس لڑکی نے سیٹھ جی کے پاس جا کر شکایت کی۔ سیٹھ جی اسی وقت دفتر سے نکل آئے اور کہنے لگے۔

"دادا سالے پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہیں۔ دیکھ تو اس لڑکی کے ساتھ ایسی ویسی بات نہ کیا کر۔ اب جو سالے تیری شکایت آئی تو بس تیری شامت آ جائے گی۔"

اور اس کے بعد دادا نے اس کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں نے اس لڑکی کے بارے میں آرٹ ڈائرکٹر سے بھی ایک بات سنی تھی۔ اس کا نام تھا ماسٹر سلطان۔ پانچوں وقت کا نمازی۔ صوم و صلوات کا پابند۔ فلمی اداروں میں سب کے سب شیطان ہی نہیں ہوتے۔ ان میں فرشتہ خصلت لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ماسٹر سلطان نے مجھے بتایا کہ چاندنی یعنی اُس لڑکی کو سیٹھ کی فلم "تتلی" کے ڈائرکٹر بھیجے والے نے بڑے لالچ دیئے کہ پیار کی پینگ بڑھائے۔ میرے ساتھ میں تجھے اپنی فلم تتلی میں تتلی کا رول دینے کو تیار ہوں۔ لیکن چاندنی رانی۔ اس نے صاف کہہ دیا میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ میں بس کوئی ایکسٹرا کا کام کروں گی میرے

دل میں ہیروئن بننے کی خواہش نہیں۔ میں نہ جانے کس مصیبت سے مجبور ہو کر یہاں آتی ہوں ورنہ کبھی نہ آؤں۔

وہ لڑکی یعنی چاندنی مجھے جب بھی کبھی سٹوڈیو میں دکھائی دیتی میں اُسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے سوچا کرتا۔ کہ اس لڑکی کو کیا دُکھ ہے۔ یہ سب سے الگ تھلگ چپ چپ کیوں رہتی ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ جب مجھے اپنی طرف ٹکٹکی لگائے یوں بڑے غور سے دیکھتے ہوئے دیکھتی تو اس جگہ سے ہٹ جاتی۔ سٹوڈیو میں چرکٹے لوگ اُسے پتھر کہنے لگے تھے۔ اگر سیٹھ جی کا ڈر نہ ہوتا تو شاید چاندنی کا سٹوڈیو میں گھسنا بند کر دیا جاتا۔

چیتو مل نے قطار میں کھڑی ایکسٹرا لڑکیوں کو پہلے تو اپنے ہاتھوں سے یوں ٹٹولا جیسے قصائی بکریوں کو ٹٹولتا ہے۔ اور پھر وہ انچ ٹیپ پکڑ کر اسٹول پہ بیٹھ گیا۔ اور ناپ لینے کے لئے باری باری لڑکیوں کو بلانے لگا۔

”ادھر آ گوری“ چیتو لال نے ایک گول مول ایکسٹرا لڑکی کو ناپ کے لئے بلایا۔

”ادھر گول ہو جا۔ یوں۔ ایسے“ چیتو مل نے اس لڑکی کو

بازو سے پکڑ کر ٹیلیفون کے ڈائل کی طرح گھمایا۔ اور اس کے ساتھ ہی انچ ٹیپ سے نہ جانے کیا کیا وہ لڑکی بلبلا کر اچھلی۔ تو روی شنکر اور چیتو لال کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ باقی کی ایکسٹرا لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔

"لمبے ناپ لکھ گول گپی کا۔ بیس انچ بائیس انچ" چیتو لال نے اپنے شاگرد سے کہا۔

اب ایک پتلی دبلی لمبے قد کی لڑکی کی باری تھی۔ چیتو نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تو وہ مسکرا کر دائیں طرف ہو گئی چیتو دائیں طرف گھوما تو وہ لڑکی بائیں طرف گھومنے لگی اتنے میں چیتو نے اس کے کولہے کے گوشت کو دو انگلیوں سے یوں پکڑ لیا جیسے کاغذ کو چٹکی لگاتے ہیں۔ اُس لڑکی کی چیخ نکل گئی۔ تو چیتو نے انچ ٹیپ اس کے منہ میں دے دیا۔

سوائے چاندنی کے سب ہنس رہے تھے۔

"دونوں بازو اوپر اٹھاؤ۔ ٹانگیں چوڑی کرو" چیتو نے کہا:
"آگے کو جھک جاؤ"

لڑکی آگے کو جھک گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ناپ نہیں دے رہی کسرت کر رہی ہے۔ ڈرل کر رہی ہے۔ اور چیتو ڈرل

ماسٹر۔ بڑی ڈرل کرائی بیچاری کو۔

اب تیسری لڑکی کی باری تھی جو بڑی نٹ کھٹ تھی۔ کھٹ کھٹ کرتی آگے بڑھی جیسے پرواہ ہی نہ ہو اُسے کسی بات کی۔

"سُناری لٹو جان کیا حال ہے تمہارا" چیتو نے اُس سے پوچھا۔

وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے کھی کھی ہنسنے لگی۔

"دھڑا دھڑ پکچروں میں آ رہی ہو۔ پر ہمیں مٹھائی نہیں کھلا رہی ہو"

"کھلاؤں گی" اس نے دبی آواز میں کہا۔

"کب؟" چیتو نے پوچھا۔

"دیوالی کو"

"اری چل جھوٹی لپاٹن" چیتو نے کہا اور بڑی بے تکلفی سے اس کے گال پر چٹکی لینے لگا تو وہ لٹو کی طرح گھوم گئی۔

اور چیتو نے انچ ٹیپ ہاتھ سے رکھ کر پھر فیتہ پکڑ لیا۔ اور لٹو جان کو لٹو کی طرح گھمانے لگا۔ کبھی الٹی جاتی کبھی سیدھی جاتی۔

سوائے چاندنی کے سب ہنس رہے تھے۔

اب چوتھی لڑکی باری تھی —— جس کی قمیض بغل کے نیچے سے ذرا پھٹی ہوئی تھی۔ چیتو نامراد کی نہ جانے کیسے وہاں نظر جا پڑی۔ بولا۔

"بڑی لمبی لمبی گھاس اگا رکھی ہے تو نے۔ کبھی کبھی اسے کاٹا بھی کر۔ شیشے کے مافق صاف رکھا کرو۔"

اس لڑکی کی بغل کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ بیچاری جھینپ گئی۔ گردن جھکالی۔

"اور یہ دیکھو کھونپ بھرالو۔ پھٹی ہوئی اچھی نہیں لگتی" چیتو نے اس کی پھٹی ہوئی قمیض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کشتی لڑتی رہی ہو کسی سے؟"

"نہیں میرے ننھے نے ہاتھ مار کر پھاڑ دی تھی" اس لڑکی نے جواب دیا۔

"بڑا وہ ہے تمہارا ننھا۔ اِدھر چل۔ اُدھر ہو۔ ذرا آگے۔ ذرا پیچھے۔ جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔ ٹانگیں سیدھی رکھو" چیتو اُسے یوں اِدھر اُدھر چلانے لگا جیسے مشین چلاتے ہوئے اس کی پھٹی ہوئی قمیض کی کھونپ بھر رہا ہے۔ اور دھاگہ بڑا موٹا لگا رہا ہے، کہ ٹانکے مضبوط رہیں سوائے چاندنی کے سب ہنس رہے تھے۔

غرض کہ چیتو نے ان ایکسٹرا لڑکیوں کو ناپتے تولتے ہوئے خوب ذلیل کیا۔ اب چاندنی کے ناپ دینے کی باری تھی۔ جو

سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔

"چلو تم آگے آؤ۔ ناپ دو۔ میری جان کے چقو"۔ چیتو نے انچ ٹیپ اچھالتے ہوئے کہا۔

نیلا مبری نے اُسے یوں گھور کر دیکھا جیسے کچا ہی چبا جائے گی چیتو کو۔ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"فیتہ ادھر دو۔ میں خود اپنا ناپ لوں گی"۔

"اری واہ ری میری فیتہ جان۔ یہ تمہیں ناپ لینا کس نے سکھایا۔ تو کتنا چونا منہ پر مل کر کے ہے مٹکا کیمرے کے سامنے۔ تجھے اس کام سے کیا لگے۔ اور جو ٹیلری کرنی ہے۔ تو ٹیکس دے۔ ٹام ٹچ۔ ڈچ بٹن۔ ہو ہو ہو۔ ہا ہا ہا"۔

چیتو نے کسی فلم کے ولین کی طرح ہنستے ہوئے چاندنی کے سینے سے ڈچ بٹن کی طرح چسپاں ہونے کی کوشش کی تو چاندنی ایک قدم پیچھے ہٹی اور چیتو کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا کہ وہ کھڑا کھڑا ہاتھی کی سونڈ کی طرح جھول گیا۔ چاندنی غصے میں تیز و تند لہجہ میں بولی۔

"کتا۔ پاجی۔ بدمعاش۔ میں سیٹھ جی کو بولوں گی تم ایکسٹرا لڑکیوں کو ناپتے تولتے بڑا ذلیل کرتے ہو"۔

ایک دھمکی - ہزار دھمکیاں - پروڈکشن انچارج روی شنکر سیٹھ جی کا نام سنتے ہی چونک گیا تھا - بولا -

"ماسٹر چیتو تم اِدھر ہٹ جاؤ - چاندنی خود اپنا ناپ دے گی - اور دیکھو تم مجاکھ نہ کیا کرو لڑکیوں کے ساتھ - یہ کچھ ٹھیک نہیں لگتا ہے"

ناپ واپ ہو چکا تھا تو ایکسٹرا لڑکیوں کو پھر سٹوڈیو ویگن میں ٹھونس ٹھانس کر سٹوڈیو پہنچا دیا گیا - میں نیلامبری کی اس جرأت سے بڑا متاثر ہوا تھا - وہ پہلی لڑکی تھی ایکسٹرا لڑکیوں کے ٹولی میں جو اپنی حفاظت کے معاملے میں اتنی سخت گیر تھی - یقیناً وہ ان سے بالکل مختلف تھی - بہت مختلف - میرے دل و دماغ میں اس کی ایک عجیب سی تصویر بننے لگی تھی -

سٹوڈیو کے سیکنڈ فلور میں اُس وقت جگت ٹاکی کی فلم "اُلو کا پٹھا" کی شوٹنگ ہو رہی تھی - ان کو اس وقت ایک ایسی ایکسٹرا لڑکی کی ضرورت تھی - جو خوبصورت ہونے کے علاوہ مکالمے بھی اچھی طرح بول سکتی ہو - اسی سلسلے میں جگت ٹاکی کا پروڈکشن انچارج روی شنکر کوئی ایسی ایکسٹرا لڑکی اِدھر اُدھر تلاش کرتا پھر رہا تھا اور بڑی پریشانی میں تھا -

روی شنکر سٹوڈیو ویگن سے باہر نکلا تو جگت ٹاکی کے پروڈکشن

انچارج نے اُسے روک لیا۔ بولا۔

"چھوٹے سیٹھ اپن کو اس وخت ایک اچھی
سی لونڈیا کی جرورت ہے۔ بڑی سندر ہو
ڈائیلاک ٹھیک ٹھاک بولتی ہو۔"

یہ سنتے ہی روی شنکر نے اپنی سوچنے کی مشین کو چالو کیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے نیلامبری کی تصویر ابھر آئی۔ اس کام کے لئے وہی ایک ایسی لڑکی تھی جس کا نام لیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اُس نے نیلامبری سے پوچھا تو وہ رضامند ہو گئی۔ روی شنکر نے اُسے جگت ٹاکی کے پروڈکشن انچارج کے ساتھ کر دیا۔ جو اُسے انٹرویو کے لئے اپنے ڈائرکٹر بامبی والا کے پاس لے گیا۔

بامبی والا۔ ایک بدنام فلم ڈائرکٹر۔ جو ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ وہ یوں شراب پیتا تھا جیسے مچھلی پانی پیتی ہے۔ وہ اپنی فلم کی ہیروئن سے لے کر ایکسٹرا تک کو نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کا ایک اسسٹنٹ پڑھا لکھا موالی تھا۔ اس کا نام تھا ڈھامی۔ جو لڑکی ہدایت کار بامبی والے کے ہتھے نہ چڑھتی اُس کے ناک میں ڈھامی نکیل ڈالتا۔ وہ بھی شرابی تھا۔

جگت ٹاکی کا پروڈکشن انچارج چاندنی کو لے کر بامبی والے

کے پاس پہنچا تو وہ چاندنی کو دیکھ کر سناٹے میں آگیا۔ اس کے سامنے ایک ایسی ایکسٹرا لڑکی کھڑی تھی۔ کہ بمبئی فلم انڈسٹری کی کوئی مشہور و معروف ہیروئن بھی اتنی خوبصورت نہ تھی۔

چاندنی ——

نیلم کی بنی ہوئی پتلی۔ کتنی چمک کتنی صباحت تھی اس کے چہرے میں۔ اور آنکھیں نیلم کے دو ٹکڑے نیلے نیلے دو جگنو۔ نیلے نیلے دو ستارے۔

سر سے لے کر پاؤں تک سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز بھی ایسی نہ تھی۔ چاندنی میں جسے بھدی یا بھونڈی کہا جاسکے۔

رسمی گفتگو پر چاندنی کا منہ کھُلا تو اس کے سفید سچے موتی دانت اور انار کی کلیوں ایسے ہونٹ دیکھ کر تو بابی والا سر سے پاؤں تک ہل گیا اور اُسے سٹوڈیو کے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جہاں بالکل تنہائی تھی۔

قسط

بامبی والا پائپ کا ایک کش لیتے ہوئے مسکرایا۔ وہ اُسے دیکھتا رہا اور چاندنی جہاں کھڑی تھی بس وہیں کھڑی رہی۔ بامبی والے نے پائپ کا ایک اور کش لینے کے بعد پائپ شیشے کی میز پر رکھ دیا۔ اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"بیٹھ جاؤ چاندنی۔"

اور چاندنی اس کے سامنے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ بامبی والا اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں باہر بارش شروع ہو گئی۔

"اوہ - یہ تو باہر بارش ہونے لگی ـ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کمرے میں آنے لگی ہے ـ اور مجھے رات سے بڑا سخت زکام ہو رہا ہے۔" بامبی والے نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور دروازے کی طرف چلا گیا ـ دروازہ بند کر کے اس نے چٹخنی لگا دی تو چاندنی کچھ گھبرا گئی ـ اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں کیا ہوا تم گھبرا کیوں گئیں؟" بامبی والے نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا۔" چاندنی نے کسی قدر بوکھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اس لئے کہ کوئی اندر نہ آ سکے۔" بامبی والے نے کہا۔

چاندنی اور زیادہ پریشان ہو گئی ـ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"تمہیں ایک آخری انٹرویو اور دینا ہے۔" بامبی والا پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ چاندنی کو بغور دیکھ رہا تھا ـ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے اپنا گنجا سر پیچھے دیوار سے لگا لیا ـ کرسی پیچھے کی طرف بہت زیادہ جھک گئی۔ اس کی ٹانگیں اب لٹک رہی تھیں۔

"اس انٹرویو کے بعد ہو سکتا ہے میں تمہیں
اپنی پکچر میں سائڈ ہیروئن لے لوں۔ اس کا ابھی
چناؤ نہیں ہوا۔ بہت سی لڑکیاں اُس رول
کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ بڑا اچھا رول
ہے۔ جو لڑکی بھی وہ رول کرے گی یکدم
اس کی مارکیٹ میں مانگ بڑھ جائے گی"
بامبی والے نے کہا۔

"کیا ہے وہ انٹرویو؟" چاندنی نے پوچھا۔

اور بامبی والا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی کے قریب آ گیا۔ بولا۔

"مجھے خوش کرو۔ میں اب تک بیس لڑکیوں
کو ہیروئن اور چالیس لڑکیوں کو سائڈ ہیروئن
بنا چکا ہوں۔ مجھے خوش کرو"

بامبی والا ذرا اور آگے بڑھا۔ تو چاندنی پیچھے ہٹ گئی۔ میں اس کمرے سے باہر کھڑکی کے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ہی سٹوڈیو کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک درخت تنا کھڑا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی گھنی شاخیں چھتری کا کام دے رہی تھیں۔ اس لئے میں بھیگنے سے بچا ہوا تھا۔

اتنے میں بابی والا ذرا اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹی۔ وہ چیخنے لگی۔

"کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔ میں تمہاری فلم میں کام کرنا نہیں چاہتی"

وہ جلدی سے دروازے کی طرف .... بڑھی تو بابی والے نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ چاندنی زخمی ناگن کی طرح پلٹی اور اس نے بابی والے کے گال پر زور سے طمانچہ دے مارا۔ تو بابی والے کے نقلی دانتوں کا اوپر کا جبڑا کھٹ سے باہر گر گیا۔ اب اس کا پوپلا منہ اور زیادہ بھیانک دکھائی دینے لگا۔ چاندنی غصے سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ اس نے بابی والے کو دو طمانچے اور لگائے اور دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ بھاگ کر باہر نکلی تو بابی والے کے بدمعاش اسسٹنٹ ڈھامی نے اُسے بدمعاشی کے زور سے روکنا چاہا۔ اُس نے چاقو نکال لیا۔ دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

"اندر چلو صاحب کے پاس نہیں تو چاقو
گھونپ دوں گا تمہارے پیٹ میں"

"میں اندر نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ تم بیشک مجھے چاقو مار دو" چاندنی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اب ڈھامی نے چاندنی کو بالوں سے پکڑ کر کمرے کے اندر گھسیٹنا چاہا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بھاگ کر اس سے الجھ گیا۔ ڈھامی کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ میرے ہاتھ خالی تھے۔ مگر میں نے حوصلہ نہ ہارا۔ ڈھامی کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر مروڑا تو چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ بارش پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ ہم دونوں برستے پانی میں گتھم گتھا ہوتے رہے۔ بارش کی وجہ سے سب لوگ سٹوڈیو کے اندر چلے گئے تھے ہمارے آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا باہر برستے پانی میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم دونوں کافی دیر ایک دوسرے پر مکے چلاتے رہے۔ لاتیں چلاتے رہے۔ آخر میں نے ڈھامی کو بھگا دیا۔ اور میں چاندنی کو ساتھ لے کر ایک طرف چل دیا۔

"روپ کمار بابو میں تمہارا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ تم اگر یہاں نہ ہوتے نہ جانے کیا ہو جاتا" چاندنی نے کہا۔

"شکریہ کیسا چاندنی۔ یہ میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا ہے" میں نے کہا۔

"تم بہت اچھے ہو بابو۔ تم بہت اچھے ہو" چاندنی بولی۔

"اور تم بہت شریف ہو چاندنی۔ تم ایسی لڑکی کو ایسی جگہوں پر نہیں آنا چاہیئے۔ تم یہاں آتی کیوں ہو" میں نے پوچھا۔

اور چاندنی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے آنسو البتہ ایک کہانی سناتے رہے جو میری سمجھ میں نہ آسکی۔

چاندنی سیٹھ سونا مل چاندنی مل سے سیٹھ بامبی والے کی شکایت کرنا چاہتی تھی۔ بارش رک گئی تھی۔ چاندنی سیٹھ جی کے کمرے میں گھس گئی۔ میں باہر کھڑا اس کی باتیں سننے لگا۔ چاندنی کی باتیں سن کر سیٹھ جی نے اُسے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔

"تم نے بڑا اچھا کیا چاندنی۔ بامبی والے سالے کو پٹیا۔ روپ کمار نے بڑا اچھا کیا۔

"تم نے بڑا اچھا کیا چاندنی۔ بامبی والے کو سالے کو پٹیا۔ روپ کمار نے بڑا اچھا کیا۔ ڈھامی سالے کو پٹیا۔ اپن تم پر خوش روپ کمار پر خوش" سیٹھ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بامبی والا اپن کی پکچر کا ڈائرکٹر ناہیں ہے۔
ایسا والا ہوتا تو اپن اس کو اسی پل سٹوڈیو
سے نکال لیتا۔ پر یہ سالا بامبی والا
جگت تا کی کا ڈائرکٹر۔ اپن کا سٹوڈیو کرایہ
پر دے کر سب فلمی پارٹی ادھر شوٹنگ

کرتا۔ اپن پولیس کو اس گڑبڑ کی کھبر کرتا تو بامبی والے اور ڈھامی سالے کو ابھی آ کر پکڑے جائیں گا۔ اپن کا سٹوڈیو بدنام ہو جائیں گا۔ فلمی بھائی اپن سے خفا ہو جائیں گا۔ سب بولیں گا۔ سیٹھ تم نے بامبی والا اور ڈھامی کو اندر کرا کر اچھا نہیں کیا۔ فلمی بھائی اپن کے خلاف ہلا غلا کریں گا۔ اپن کے سٹوڈیو میں کوئی پارٹی کھیلنے ناہیں آئیں گا۔ اپن کا آمدنی مارا جائیں گا۔ اِدھر پورا پانچ سو مزدور لوگ کام کرتا پڑا۔ اپن ان کو پگار کدھر سے دیں گا۔ سن رہی ہو چاندنی؟"

"ہاں سیٹھ جی میں بڑے غور سے سن رہی ہوں۔" گردن جھکائے سیٹھ جی کے سامنے چپ چاپ کھڑی چاندنی گھمبیر آواز میں کہا۔

"سیٹھ جی یہ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے"

"بڑے افسوس کا بات ہے۔ اپن کو بڑا افسوس ہے۔ پر تم اس بات کو اب رفع دفع کرو چاندنی۔ جگت نرائن ٹاکی کا سیٹھ چندو لعل بھائی اِدھر آئیں گا تو اپن اس کو بولے گا۔ تم سالا کیسا بنڈل لوگ اپنی پکچر لیتا۔ جو شریف لونڈیوں کے ساتھ بڑی گڑبڑ کرتا۔" سیٹھ سونا لال چاندی مل نے کہا اور جیب سے بٹوہ نکال کر اُس میں سے دس دس روپے کے تین نوٹ نکال کر چاندنی کو دیئے۔ بولا۔

"بارش ہو جانے سے وہ سالا کیمرہ مین

بخار میں پڑ گیا۔ آج اِدھر اپن کا کام ناہیں
ہو سکیں گا۔ شوٹنگ کینسل۔ جاؤ تم کھاؤ پیو
موج اڑاؤ۔"

چاندنی نے یہ روپے لینے سے انکار کیا لیکن سیٹھ نے نوٹ واپس نہ لئے۔ چاندنی سلام کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اب وہ گھر جانا چاہتی تھی۔ میں بس اسٹینڈ تک اس کے ساتھ گیا تاکہ بامبی والا اور ڈھامی اُسے راستے میں پھر کہیں تنگ نہ کریں۔

نیند ہماری خواب تمہارے

جب سے یہ واقعہ رونما ہوا تھا چاندنی اس سٹوڈیو میں نہیں آتی تھی۔ اب وہ رنجیت سٹوڈیو میں جاتی تھی۔ فلم پیاس کی دنیا کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ متواتر کئی روز سے میں اور اس فلم کی ہیروئن مس رمبھا ایک بہت بڑے سیٹ پر کام کر رہے تھے۔ متواتر کئی روز سے کام کرتے رہنے سے رمبھا کچھ علیل ہو گئی تھی۔ مجھے رمبھا کے ساتھ سیٹ پر کام کرنے کے لئے شام کو ٹھیک چھ بجے سٹوڈیو پہنچ جانے کا نوٹس ملا تھا۔ اور میں ساڑھے پانچ بجے ہی

سٹوڈیو پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ رمبھا کی علالت کی وجہ سے شوٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔ اور میرے دل میں یہی آئی کہ چلو چل کر کسی سینما کا پہلا شو دیکھتے ہیں۔ اور میں ٹہلتا ٹہلتا سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔ تو مجھے یوں معلوم جیسے چاندنی میرے دل کے کسی کونے سے نکل میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میرے کان اس کے قدموں کی آہٹ سن رہے تھے۔ مجھے اس کے بدن سے چھوٹتی ہوئی قدرتی مہک مدہوش کرنے لگی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ نہ صرف سوتے میں بلکہ جاگتے ہوئے بھی میں چاندی کے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ دادر بس اسٹینڈ پر ہم اکثر ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگتے۔ میں اُسے رنجیت سٹوڈیو کے دروازے پر چھوڑ کر اپنے سٹوڈیو کی طرف جاتی سڑک پر ہو جاتا۔ اُس دن بھی میرے قدم خود بخود رنجیت سٹوڈیو کی طرف اٹھ رہے تھے۔

اور پھر جب میں رنجیت سٹوڈیو کے مین گیٹ کے سامنے پہنچا تو اتفاقاً چاندنی اندر سے نکلی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آج ان کی شوٹنگ بھی کینسل ہو گئی ہے۔ تو میں نے چاندنی سے کہا۔

"تم اگر خفا نہ ہو جاؤ تو ایک بات کہوں چاندنی۔"

"کہو بابو کیا بات ہے۔" چاندنی نے پوچھا۔

"میرا دل آج سینما دیکھنے کو کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو ضرور دیکھو بابو۔" چاندنی نے کہا۔

"کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گی؟" میں نے پوچھا۔

"چلی چلوں گی۔ مگر ایک شرط پر۔"

"وہ کیا؟"

"تم مجھے میرے گھر چھوڑ کر آؤ گے۔"

"بس اتنی سی بات۔ چلو تو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"کونسی پکچر دیکھو گے؟"

"کوئی اچھی سی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آؤ تو پہلے کہیں چائے پی لیں۔"

ہم ایرانی ہوٹل میں چائے پی۔ پوڈر کی چائے۔ جو سالی زیادہ چینی ڈالنے سے زیادہ کڑوی ہوتی جاتی ہے۔ ہم چائے پیتے رہے میلے میلے چہرے میلے میلے کپڑے جیسے ہمیں گھورتے رہے۔ ہم دونوں چائے پی کر نکلے تو فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔

"چاندنی چنے پسند ہیں تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کیک، پیسٹری سے تو خستہ بہت اچھے لگتے ہیں مجھے"

چاندنی نے کہا۔

سامنے خستہ چنوں والا ڈھابہ لئے بیٹھا تھا۔

"ایک آنے کے چنے دینا۔ ذرا گرم گرم"۔

"آنے کے نہیں بھائی دونی کے لو"۔ چاندنی نے کہا۔

سیٹھ سے اس مہینے کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ میں ذرا تنگی میں تھا۔ ہیرو ایک فلم میں کام کر رہا ہو اور تنگی میں ہو۔ شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے۔ لیکن میں تو ایک بالکل نیا ہیرو تھا۔ جسے ایک فلم میں سیٹھ نے اپنی عنایت سے چانس دیا تھا اچھی تنخواہ نہیں دی تھی۔ بس تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ جبکہ دوسری فلموں کے ہیرو لاکھ لاکھ اور دو دو لاکھ کا رہے تھے ایک فلم سے۔ مگر میں چونکہ نیا تھا۔ ناموزوں تھا۔ اس لئے تنخواہ بہت کم دی گئی۔ اور میں نے اسی کو غنیمت جانا کہ چلو چانس تو مل گیا۔ اس فلم میں اگر چہ چاہو گیا تو میں بھی لاکھوں میں کھیلنے لگوں گا

"وارے لیمنگٹن روڈ کیسے جایا جائے"۔ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس میں ریل میں یا ٹرام میں؟"

"ٹرام میں چلو۔ ابھی تو سینما شروع ہونے میں بہت وقت ہے" چاندنی نے کہا۔

دو منزلہ ٹرام کی اوپر کی منزل پر اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لیمنگٹن روڈ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ تمام شہر پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے لیمنگٹن روڈ پہنچ گئے۔

"کونسی فلم دیکھیں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی دیکھ لو۔ مجھے فلموں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔"

"پھر تم فلموں میں کام کیوں کرتی ہو؟"

"اپنا اور اپنی بوڑھی ماں کا پیٹ پالنے کے لئے۔"

"تمہارا باپ کچھ نہیں کرتا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو مدت ہوئی مر گیا۔" چاندنی نے جواب دیا۔

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا جی ڈرائیور تھے۔ ایک حادثے میں مر گئے۔ میں ان دنوں سکول میں پڑھتی تھی۔" چاندنی نے کہا۔

"کوئی بھائی نہیں ہے تمہارا؟"

"نہیں ہے۔"

"اور کوئی بہن ؟"

"نہیں ہے ۔"

"اوہو ۔ یہ تو دیوداس فلم کی طرح بڑی اداس بات ہے" ۔ میں نے کہا ۔

"ہاں ۔ مگر میں اس وقت اداس باتیں نہیں کرنا چاہتی ۔" چاندنی نے کہا ۔۔۔ "چلو پربت پر اپنا ڈیرہ دیکھیں ۔"

"چلو ۔ سنا ہے اُس میں اودے شنکر کے وہ ناچ بھی ہیں ۔"

"ہاں ۔ منی پوری اور کتھا کلی ۔ اودے شنکر کا ناچ مجھے بہت پسند ہے ۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے روکسی سینما کے پاس پہنچ گئے ۔ سامنے میٹرو سینما تھا ۔ جس میں کلپنا فلم لگی ہوئی تھی اور بڑا رش سے لے رہی تھی ۔ ہال فل جا رہا تھا ۔ ٹکٹ بند ہو چکی تھی ۔ ادھر روکسی میں بھی چھوٹے درجے کی ٹکٹیں بند ہو چکی تھیں ۔ بڑے درجے کی ٹکٹیں بلیک میں مل رہی تھیں ۔ دو روپے کا ٹکٹ دس روپے میں ۔ میں بلیک کرنے کرانے کا شروع سے قائل نہیں ہوں ۔ دو روپے کا ٹکٹ لینے والوں کی قطار میں کھڑا ہو گیا ۔ لیکن یہ قطار اتنی لمبی تھی کہ ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی ۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ ٹکٹ کسی طرح مل جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ کھڑکی بند ہو گئی ۔ شو شروع ہو گیا ۔ میں نے پوچھا

چاندنی کے پاس چلا آیا۔

"چاندنی میں نے بڑی کوشش کی ٹکٹ نہیں مل سکی۔"

"چھوڑو پھر کسی دن دیکھ لیں گے۔" چاندنی نے کہا۔

"کوئی اور فلم دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"فلم دیکھنا کیا ضروری ہے۔ چلو مالا بار ہل، ہنگینگ گارڈن کی سیر کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کسی سینما کی زہریلی ہوا کھانے کی بجائے سمندر کی صاف ستھری ہوا کھاتے ہیں۔"

کتنی سمجھ دار تھی چاندنی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو سینما نہ دیکھنے پر ناک میں دم کر دیتی اور نہ جانے کیا کیا کرتی۔

رج روڈ کے گھنے سایہ دار درختوں کی پرچھائیوں میں پیدل چلتے ہوئے ہم ہنگینگ گارڈن پہنچ گئے۔ ہم کنارے پر ہرے ہرے ناریلوں کے سایوں میں کھڑے سمندر کی طرف دیکھتے رہے۔ لیکن ہم نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم ان گنت باتیں کر گئے ہیں۔ ہمارا بیچ خاموشی سمندر کی طرح بڑی گہری اور وسیع تھی۔

وادی پر اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا اور شہر کی روشنیاں چمک

اٹھی تھیں۔

"اب تمہیں مجھ کو گھر چھوڑ کر آنا ہوگا بابو۔" چاندنی نے لمبی گہری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"کہاں رہتی ہو تم چاندنی؟" میں نے پوچھا۔

"بوری بندر کے قریب۔"

میں نے سوچا وہ تو اچھا علاقہ ہے۔ کسی فلیٹ میں رہتی ہوگی۔

ہم دونوں پھر ٹرام میں سوار ہو گئے۔

بوری بندر ٹرام سے اُترے تو ہمارے سامنے چھ سات راستے تھے۔ ایک بڑی سڑک سیدھی ریگل سینما، اپالو بندر اور تاج محل کی طرف جاتی تھی۔ اور دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا کے دفتر کے سامنے سے ہوتی ہوئی کرافورڈ مارکیٹ کو جاتی ایک اور سڑک۔ تیسری سڑک دھوبی تلاب، مرین لین کی طرف۔ جس راستے سے کہ ہم ابھی آئے تھے۔ ایک اور سڑک کیپٹل سینما کے برابر سے بمبئی جیم خانہ کو۔ اور دوسری وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی سینٹ جارج ہسپتال کو۔ لیکن جس راستے سے چاندنی مجھے ساتھ لے کر چلی وہ کچھ اور ہی راستہ تھا۔

جنرل پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم فریئر روڈ

پہنچے۔ جہاں خستہ مورگ۔ گھٹیا قسم کے ہوٹل۔ پنجابی نانبائیوں کی دکانیں شرابی مزدور۔ ملاح اور موالی پلتے جاتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں بندرگاہ میں لنگر ڈالے پڑے جہازوں کا انسانی کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

"تم اس سڑک پر کہیں رہتی ہو چاندنی؟" میں نے پوچھا۔

"سڑک پر نہیں اس اگلی گلی میں۔" چاندنی نے جواب دیا۔

اگلی گلی۔

جہاں ایک زرد اداس روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اندھیری اونچی عمارتوں کی پرچھائیاں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ مچھلی، تیل، ڈالڈا کے بگھار، تاڑی، فینائل اور نہ جانے کیسی کیسی سڑی گلی چیزوں کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کتنے ہی چوہے چھچھوندروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بھوری سی ایک بلی اپنی سرخ آنکھیں چمکا کر ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ گلی میں کہیں اندھیرا تھا، کہیں اجالا۔

"میں یہاں رہتی ہوں تیسرے مالے پر۔" ایک مکان کے سامنے ٹھہرتے ہوئے چاندنی نے کہا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔ نمستے۔" میں نے چاندنی سے کہا۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم اتنی دور تکلیف کر کے آئے ہو بابو۔ ایک پیالی چائے تو پیتے جاؤ۔" اور میں خاموش رہا۔ میں نے دل میں سوچا۔ چاندنی مہربان ہے مجھ پر۔ چائے کی پیالی تیار ہونے اور پینے تک کافی رات ہو جائے گی۔ اور پھر شاید چاندنی کہے گی کافی رات ہو گئی ہے۔ یہیں سو جاؤ بابو۔ اور پھر شاید ــــ شاید ــــ میں دل میں نہ جانے کیا کچھ سوچنے لگا تھا۔

سیڑھیوں میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر منزل کی گیلری میں لوگ سوئے ہوئے تھے۔ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں اور چکر کھاتی اوپر اٹھتی چلی گئی تھیں۔ میں ایک جگہ گرتے گرتے بچا۔ چاندنی بولی۔

"لاؤ اپنا ہاتھ بابو کہیں گر نہ جانا۔"

چاندنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں لکڑی کی سیڑھی پر نہیں ستاروں کی کسی سیڑھی پر قدم رکھ رہا ہوں۔

ہم دونوں تیسری منزل پہ پہنچ گئے۔ چاندنی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے پہلے کھانسنے کی آواز آئی۔ اور اس کے بعد کسی نے کمزور کانپتی آواز میں کہا۔

"تم آ گئیں چاندنی"

اور تھوڑی دیر میں دروازہ کھٹ سے کھل گیا کمرے میں دھندلی دھندلی لالٹین جل رہی تھی۔ جو روشنی کم اور دھواں زیادہ دے رہی تھی۔ یہ کمرہ ہی سارا گھر تھا۔ ایک کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹائی اور پھٹے پرانے بچھونے پڑے تھے۔ دوسرے میں چولہا تھا۔ جہاں سے دھواں اٹھ کر سارے کمرے میں پھیل رہا تھا۔ اس سے ذرا ایک کرسی ٹین کا ایک صندوق ایک کنستر اور کمرے کے درمیان اسی کی الگنی تنی ہوئی تھی۔ جہاں دو پرانی ساڑھیاں سوکھنے کو لٹکائی گئی تھیں۔ یہ تھا وہ کمرہ جہاں چاندنی اپنی ماتاجی کے ساتھ رہتی تھی۔

چاندنی نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"روپ کمار بابو یہ ہیں میری ماتاجی۔

اور ماتاجی یہ ہیں روپ کمار بابو جنہوں نے اس دن مجھے اس بدمعاش کے پنجے سے چھوڑایا تھا۔ مجھے یہاں چھوڑنے آئے ہیں"

"ماتاجی نمستے" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پرنام کیا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ کھوں کھوں" چاندنی کی ماتا نے کہا۔ اور کھانسنے لگی۔ بیچاری پتلی دبلی دق کی ماری عورت۔ جس کا جسم جس کا چہرہ ایک کھنڈر کی طرح تھا۔ اداس اور ویران۔

"بیٹا کرسی پر بیٹھ جاؤ" چاندنی کی ماں نے پھولی ہوئی سانس میں کہا۔

"چاندنی تو جلدی سے چائے تیار کر بابو کے لئے"

اور چاندنی نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ اب بڑھیا راشن کی باتیں کرنے لگی پھر بڑھیا نے اپنے وطن جالندھر کا ذکر شروع کر دیا۔ جالندھر اور لاہور کچھ اتنے دور نہیں۔ بڑھیا جالندھر کی باتیں کرتی رہی تو میری آنکھوں میں جالندھر کے ساتھ لاہور کی تصویر بھی گھومتی رہی۔ مدت ہوئی۔ بڑھیا نے بتایا کہ چاندنی کا پتا ایک فرم کا ڈرائیور ہو کر جالندھر سے بمبئی چلا آیا۔ ایک سال بعد اس نے اپنی بیوی اور بچی کو بھی بمبئی بلا لیا۔ تو اسے خدا کا بلاوا آگیا۔ حادثہ میں مارا گیا۔ فرم نے مرنے والے کی بیوہ کو ایک مہینے کی تنخواہ کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ بھی دیا۔ جو خرچ ہو گیا تو چاندنی کو فلمی دنیا کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اگر بڑھیا تندرست ہوتی۔ اسے دق نہ ہو گئی ہوتی تو وہ شاید اپنی بیٹی کو کبھی بھی گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی......

تو چاندنی کو فلمی دنیا کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اگر بڑھیا تندرست ہوتی۔ اُسے دق نہ ہو گئی ہوتی تو وہ شاید اپنی بیٹی کو کبھی بھی گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی۔ چائے تیار کر کے چاندنی میرے لئے بے پرچ کی پیالی میں لائی۔ خود اس نے کنڈا ٹوٹی پیالی میں چائے پی اور اپنی ماتا کو تیلی کے کٹورے میں دی۔

چائے پینے کے بعد میں نے ایک سگریٹ پیا۔ باتیں ہوتی رہیں اور پھر جب سگریٹ ختم ہونے پر آیا تو میں نے کہا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں"

"جیتے رہو بیٹا۔ تم سے مل کر دل کو بڑی تسلی ہو گئی ہے۔ ذرا چاندنی کا خیال رکھا کرو۔ زمانہ بڑا خراب ہے" بڑھیا نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ماتا جی۔ میں چاندنی کا
ہمیشہ خیال رکھتا ہوں" میں نے کہا "نمستے"

"ٹھہرو بابو میں تم کو روشنی دکھاتی ہوں۔ نہیں تو آپ پھر کہیں گر نہ جائیں" چاندنی نے کہا۔

اور جلدی سے اُس نے ٹین کا چراغ جلایا۔ اور میری ساتھ ہو گئی۔ چراغ کی روشنی میں سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے چاندنی سے کہا۔

"چائے کا شکریہ جو بڑی مزیدار تھی۔"

"شرمندہ کرتے ہو بابو۔ میں تو تمہاری کچھ سیوا نہیں کر سکی۔" چاندنی نے کہا۔

میں نے نیچے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ چراغ ہاتھ میں لیئے وہ کٹہرے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ جھلملاتی لو کی روشنی میں اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس میں کیا کچھ نہ تھا، شکریہ، دوستی، دل لگی، پیار، وعدہ —

میں جوں جوں سیڑھیاں اترتا گیا چراغ کی روشنی کم ہوتی گئی۔ اور جب میں نے نیچے اتر کر سیڑھیوں کے اندھیرے کنوئیں کی تہ سے اوپر دیکھا تو چاروں طرف پھیلے اندھیرے میں دور اوپر چراغ کی روشنی ٹمٹماتا ستارہ دکھائی دی۔ اور میں سیٹی بجاتا ہوا بوری بندر کی طرف چلا۔

اُس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ چاندنی نہ جانے کیسے کیسے روپ دھارتے ہوئے میرے خیالوں میں جگنو کی طرح ٹمٹماتے ہوئے میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ اور پھر جب مجھے نیند آ گئی —

میں سو گیا تو چاندنی میرے سپنوں میں موجود تھی۔ گڑیا سی لڑکی ــــ میرے سپنوں کی تتلی ــــ میرے سپنوں کی چاندنی ــــ!!

بمبئی کی قلوپطرہ

مس رضیہا ـــ

فلم انڈسٹری کی مشہور و معروف ہیروئن ۔ جو ایک فلم میں کام کرنے کا تین لاکھ روپیہ لیتی تھی ۔ دو لاکھ وائٹ اور ایک لاکھ بلیک ۔ وہ اب تک اکتیس فلموں میں کام کر چکی تھی ۔ اُس کی اب تک سات فلمیں سپرہٹ ہو چکی تھیں ۔

وہ بڑی حسین و جمیل تھی ۔ اُسے بمبئی کی قلوپطرہ کہا جاتا تھا ۔ مصر کی ملکہ قلوپطرہ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ مضبوط جسم کے خوبرو جوانوں

کے ساتھ عیاشی کیا کرتی تھی۔ خوبرو اور مضبوط جسم کا نوجوان اس کی کمزوری تھا۔ وہ چند روز اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی اور پھر اُسے سانپ ڈسوا کر یا زہر کھلا کر ہلاک کر دیتی۔ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے بڑی بدنام تھی۔ اور رمبھا بھی ساری بمبئی میں بڑی بدنام ہو رہی تھی۔ وہ نت نئے خوبرو اور مضبوط لونڈے پھانستی رہتی تھی۔ وہ ایسے کسی لونڈے کو جس پر اس کی طبیعت آ جاتی شہزادہ بنا دیتی۔ اُسے خوب کھلاتی پلاتی، اچھے اچھے ملبوسات پہناتی۔ اس پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتی اور پھر کچھ عرصہ گزرنے پر اُسے اچھی طرح چوس چاس کر آم کی گٹھلی کی طرح ایک طرف پھینک دیتی۔ وہ اُس لونڈے کو پیار کی اتنی اونچی سیڑھی پر چڑھا کر یکدم سیڑھی نیچے سے کھینچ لیتی اور وہ دھڑام سے منہ کے بل نیچے گرتا۔ اُس نے کئی لڑکوں کو چوس چاس کر زندگی کے کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا تھا۔ شوٹنگ کے دوران سٹوڈیو میں اس کے متعلق بے شمار باتیں سُنی تھیں۔ حسین و جمیل ہونے کے علاوہ وہ جو کچھ بھی تھی مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا۔

رمبھا شوٹنگ کے دوران مجھے جن نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ اور اپنے ہونٹوں پر کھلی جس مسکراہٹ سے مجھے موہنے کی کوشش کیا کرتی

تھی۔ ابتدا میں مَیں نے اس کا بڑی آسانی سے مقابلہ کیا۔ میرے دل
میں تو بس چاندنی بسی ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس نے مجھ پر نہ جانے
کیا جادو کر دیا۔ کہ میرا دل اُس کی طرف کھچنے لگا۔ شروع شروع میں
ہم میک اپ روم میں میک اپ کرتے ہوئے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔
پھر یہ بے تکلفی ذرا اور بڑھی تو ہم دونوں آزادانہ طور پر ایک دوسرے
کو ہنسی مذاق بھی کرنے لگے۔ اس کے بعد باہمی میل جول کی کچھ منزلیں
اور طے کر گئے تو جب ہمارا شاٹ نہ ہوتا ہم سٹوڈیو کے باغیچے یا
کسی الگ تھلگ خالی کمرے میں چلے آتے اور وہاں خوب دل لگی
کرتے۔ میٹھی چٹکیاں، گدگدی، دھکا پیل، دھینگا مشتی اور پھر
ایک میٹھا میٹھا بوسہ۔ کبھی وہ میرا بوسہ لے لیتی کبھی میں اس کا۔
اور ہماری یہ وابستگی ایک دوسرے کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔
اور پکچر بس تھوڑی سی باقی رہ گئی۔ پکچر کے رش سین دیکھ کر ہی
ڈسٹری بیوٹروں نے پکچر خرید لی تھی۔ تاریخ کا اعلان کر دیا گیا تھا۔
دیوالی کے تہوار پر پانچ بڑے شہروں میں پکچر بیک وقت ریلیز ہو
رہی تھی۔ سیٹھ موتی لال چاندی لال بڑی جلدی کر رہے تھے۔ دن رات
شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک دن شام کے پانچ بجے رمبھا کا آخری شاٹ
ختم ہو گیا۔ میرے ابھی دو شاٹ باقی تھے۔ رمبھا نے مجھ سے کہا۔

"میں کیبن میں چل کے بیٹھتی ہوں۔ تم وہیں آجانا"

"ہاں تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں" میں نے کہا۔

اس کے آدھے گھنٹے بعد میرے دو شارٹ بھی ختم ہو گئے۔ اور ڈائرکٹر نے تمام ایکسٹرا لڑکیوں اور لڑکوں کو چھٹی دے دی۔ اور خود بھی چھٹی کرنا چاہتا تھا کہ اُسے نہ جانے کیا سوجھی۔ رمبھا کے دو اور کلوزاپ لینے کا اُسے خیال آیا۔ اس کے اسسٹنٹ نے اُسے بتایا تھا کہ مس رمبھا ابھی گھر نہیں گئی۔ اُدھر کیبن میں بیٹھی ہے۔ وہ سیدھا کیبن میں پہنچا۔ بولا۔

"مس رمبھا ابھی میں تمہارے دو کلوزاپ اور لوں گا"

"نہیں میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے" رمبھا نے جواب دیا۔

"بس ایک ہی تو شاٹ ہے"

"کل لے لینا۔ اس وقت مجھے جانے دو۔ سر پھٹا جا رہا ہے"

یہ کہتے ہوئے رمبھا نے ڈائرکٹر کو مسکراتے ہوئے کچھ اس ادا سے دیکھا کہ اُسے سرور ہو گیا اور وہ شاٹ لینا بھول گیا۔ رمبھا جلدی سے باہر نکل آئی۔ اِدھر پارک میں اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ

میک اپ اتارے بغیر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی - اور ہارن بجایا۔ میں اس وقت میک اپ روم میں اپنا چہرہ صاف کر رہا تھا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو رمبھا نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا اُدھر سٹوڈیو کے مین گیٹ کی طرف چلے آؤ - میں جلدی سے میک اپ روم سے باہر نکلا - اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مین گیٹ پر پہنچا - اُدھر سڑک پر رمبھا گاڑی کو روکے میرا انتظار کر رہی تھی - میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا - رمبھا نے گاڑی سٹارٹ کر دی - جو آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئے بس اسٹاپ کے پاس سے گزری اور پھر اس کی رفتار تیز ہو گئی - گاڑی اندھیری سے نکلی - سٹیشن گیٹ سے گزری - رمبھا ساتھ لے کر باندرہ سے ایوان فریزر میں گئی - وہاں سے گاڑی تاج محل ہوٹل کے پیچھے وائٹ ویڈلا کی پورچ میں جا رکی - وہ مجھے ساتھ لے کر دکان کے اندر چلی گئی - میرے تین ریڈی میٹ سوٹ خریدے۔ نیلون کی مردانہ جرابیں - ٹوڈلر کی ٹائیاں - کیمبری رومال ریڈی میڈ قمیص - اس دکان سے نکل کر وہ مجھے جوتوں کی دکان میں لے گئی - میرے لیے نہایت ہی نفیس دو جوڑے خریدے - جوتوں کے اس دکان سے نکلے تو اس نے مجھے ایک بڑی گھڑی اور ہیرے کی انگوٹھی خرید کر

دی - میں اُسے روکتا ہی رہا کہ یہ تم کیا کر رہی ہو - کیوں کر رہی ہو خواہ مخواہ اپنی دولت ضائع نہ کرو - آخر کچھ پتہ تو چلے تم ایسا کیوں کر رہی ہو - تو رمبھا نے مجھے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ میری خوشی - تم مت بولو اِس معاملے میں -

شاپنگ ہو چکی تو گاڑی باندرہ کی طرف ہولی اور پالی ہل پر چلی گئی - جہاں رمبھا ایک بڑے نفیس بنگلہ میں رہتی تھی - جس کا نام تھا سنی ڈیو - گاڑی گراج میں کھڑی کر کے وہ مجھے ایک کمرے کی طرف لے چلی تو برآمدے میں اُس کا باپ برکت بابو آرام کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا - وہ باورچی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا - اتنی بڑی اور عالی شان کوٹھی میں صرف تین انسان رہتے تھے - رمبھا، اس کا باپ برکت بابو اور خانساماں -

میں نے رمبھا کے باپ برکت بابو کے متعلق سٹوڈیو میں جو کہانی سن رکھی تھی وہ یہ تھی کہ برکت بابو کسی زمانے میں بڑے بانکے چھبیلے اور رئیس تھے - دہلی میں بڑے عیش و آرام سے زندگی گزار رہے تھے - رنگین مزاج تھے - چاوڑی میں گانا سننے اکثر آیا جایا کرتے تھے - وہاں ان کا پیار بڑا اچھا گانے والی ایک رنڈی گوری بائی سے تعلق ہو گیا - کچھ عرصہ کے بعد برکت بابو نے اس کو اپنے گھر میں ڈال لیا - باپ دادا کی چھوڑی ہوئی

جائداد سے خوب گلچھرے اڑاتے رہے۔ شراب بڑی پیتے تھے برکت بابو۔ ساری جائداد شراب میں گھول گھال پی گئے۔ مفلس ہو گئے۔ گوری بائی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ جس کا نام شمیم تھا۔ جوان دنوں نوین میں پڑھتی تھی جبکہ گوری بائی چند روز بیمار رہ کر مر گئی۔ اور برکت بابو غم غلط کرنے کے لیے شراب کے ساتھ افیم بھی کھانے لگے۔ نہ جانے کیا ہیرا پھیری کرتے گزر اوقات بڑی مشکل سے ہو رہی تھی۔ شراب اور افیم کے نشے میں برکت بابو کو بڑی دور کی سوجھی۔ انھوں نے اپنی بیٹی شمیم کے حسن و جمال سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے فلم اسٹار بنانے کی ٹھان لی۔ بمبئی چلے آئے۔ بابو جی بھڑوا بن گئے۔ نہ جانے کیا جوڑ توڑ کر کے بیٹی کو ہیروئن کا چانس دلوایا۔ اس کا فلمی نام رمبھا رکھا۔ پہلی ہی پکچر ہٹ گئی۔ دوسری سپر ہٹ۔ تیسری پکچر نے ڈائمنڈ جوبلی کی۔ رمبھا شہرت کے آسمان پر پہنچ گئی۔ برکت بابو دولت میں کھیلنے لگے۔ اب انہوں نے شراب اور افیون کے ساتھ مارفیے کا ٹیکہ بھی شروع کر دیا۔ لیکن اچانک رمبھا کی طبیعت نے ایک پلٹا کھایا۔ اس نے پر پرزے نکالے تو من مانی کرنے لگی۔ لونڈوں سے عشق کرنے کا چسکا پڑ گیا۔ برکت بابو شراب پیتے تھے رمبھا خوبرو چکنے لونڈوں کی۔ پہلے اس کی دولت اپنے باپ برکت بابو کے ہاتھ

میں ہوتی تھی پھر وہ بابو کو روٹی کپڑے کے علاوہ صرف اتنی رقم دینے لگی جس سے وہ نشہ پانی پورا کر سکیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ برکت بابو اپنی بیٹی سے ہر وقت خفا رہنے لگے تھے۔

اس وقت بھی وہ خفا خفا نظر آ رہے تھے۔ لیکن رمبھا ان کی خفگی کی ذرا پرواہ نہ کرتے ہوئے ان سے کوئی بات کیے بغیر مجھے سیدھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ جہاں بیٹھ کر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر رمبھا نے برکت بابو کی باتیں چھیڑ دیں۔ بولی۔

"روپ بابو یہ میرے اولڈ مین ہیں۔ لیکن پاگل ہیں۔ ہر وقت پاگل پن گھولتے رہتے ہیں۔ نشہ پانی کرتے ہیں"

"کونسا نشہ؟" میں نے پوچھا۔

"شراب، افیم اور گانجا۔"

"بیک وقت تین چیزیں؟"

"اور مار فیا بھی۔ یہ تو میں تمہیں بتانا بھول گئی۔"

"اے رمبھا۔ رمبھا۔" یہ برکت بابو کی آواز تھی جو کرسی سے اٹھ کر کمرے میں دروازے تک آ گئے تھے اور مجھے بری طرح گھورتے ہوئے جمائی پر جمائی لے رہے تھے۔

"کیا ہے بابو جی"؟ رمبھا نے بڑی بے رخی سے پوچھا۔

"یہ اتنی ساری چیزیں ان بابوجی کے لیے تو آگئیں کیا تھا جو ایک چپل ایک قمیض میرے لیے بھی لے آتیں۔" برکت بابو نے کہا۔ اور میں جھینپ سا گیا۔ کہ یہ بوڑھا اپنے دل میں مجھے نہ جانے کیا سمجھتا ہو گا۔

"اچھا اچھا بابو میں پیسے دوں گی خود ہی لے آنا۔" رمبھا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت مستک نہ چاٹو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

"اچھا میں چلا جاتا ہوں۔ پر میں نے کہا نشے کی ٹوٹ ہو رہی ہے۔"

اور رمبھا نے اپنے جوڑے سے دس دس کے تین نوٹ نکال کر برکت بابو کی طرف اچھال دیے۔ تو بابو کا پیلا چہرہ ذرا سرخ ہو گیا۔ جلدی سے نوٹ اٹھا کر انھیں الٹا پلٹا کر دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔ اور رمبھا غسل خانے میں چلی گئی۔ میں میز پر سے ایک فلمی پرچہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

اور پھر جب رمبھا غسل خانے سے واپس آئی اس نے گولڈ برکیڈ کی فراک پہن رکھا تھا۔ بالوں میں کورنسر کے جواہرات کی لڑیاں سجا رکھی تھیں۔ اس وقت تو وہ واقعی قلوپطرا معلوم ہو رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے غسل خانے

میں جا کر غسل کرنے اور کپڑے بدلنے کو کہا۔ مرینو کلب جانے کا پروگرام تھا۔

نکھری ہوئی مہکی مہکی رات بڑی حسین تھی۔ آسمان میں تاروں کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ ساتھ والے بنگلے میں کوئی پیانو پر ایک فلمی گیت کی دھن بجا رہا تھا۔

○

محبت گرم گرم آنسو

محبت سرد سرد آہیں

چاندنی کو اُس کی سہیلی کلپنا کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ میں رمبھا کے گھر آنے جانے لگا ہوں۔ اور اُس کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہوں۔ وہ مجھے کئی دنوں سے ادھر اُدھر ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پکچر ختم ہو چکی تھی۔ اب اُس کی ریلیز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں اپنا وقت زیادہ تر رمبھا کے پاس سنی ویو ہی میں گزارتا تھا۔ نہ جانے اس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے منگو دادا سے ملنے ایکسٹرا یونین میں جاتا یا سیٹھ جی کو سلام کرنے سٹوڈیو

میں ۔ بس تھوڑی دیر وہاں ٹھہرتا اور واپس ۔ رمبھا کے بغیر کہیں میرا دل نہ لگتا تھا ۔ اُس نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو پھونک دیا تھا ۔

اچانک ایک دن جبکہ میں دادر مین روڈ کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا ۔ چاندنی سے میری ملاقات ہوئی ۔ وہ بڑی گھبرائی ہوئی تھی ۔ میں نے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اُس کی ماں سخت بیمار ہے ۔ کھانسی اور بخار کی شدّت سے اس کا بُرا حال ہو رہا ہے ۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے چاندنی نے مجھے بتایا ۔

"میں ماتا جی کو ہسپتال لے گئی تھی ۔ وہاں کوئی بیڈ خالی نہیں ۔ دو چار روز میں شاید کوئی بیڈ خالی ہو جائے "

"تو ماتا جی کو کسی ڈاکٹر سے دکھایا ہوتا ۔" میں نے کہا ۔

"دکھایا تھا ۔ وہ کہتا ہے ماتا جی کو دق ہے ۔ اس کا علاج تو ہسپتال ہی میں ٹھیک ہو سکے گا ۔" چاندنی نے کہا ۔

"ڈاکٹر نے کوئی دوائی نہیں دی ماتا جی کو " میں نے پوچھا ۔

"ایک نہیں اُس نے تو کئی دوائیں کھلا دی ہیں ۔ بڑی مہنگی ۔ کم سے کم ایک سو روپیہ ہو تو کام چلے " رمبھا نے کہا ۔

" ایک سو روپیہ "

" ہاں ۔ سب دوائیں پیٹنٹ ہیں ۔ ان میں ٹیکے بھی ہیں "

"دق کے لیے ٹیکے تو بہت ضروری ہیں"

"میرے کچھ پیسے بکتے ہیں رجنیش والوں کی طرف لینے آئی ہوں۔ شاید مل جائیں"

"پیسوں کی تم ذرا فکر نہ کرو چاندنی۔ سو روپیہ مجھ سے لے جاؤ۔ ماتاجی کا اچھی طرح علاج کرو۔ جتنے پیسے لگیں گے میں لگاؤں گا۔ تمھاری ہنیں وہ میری ماتا بھی ہیں۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ کل آؤں گا ان کی خبر لینے" میں نے کہا۔ اور جیب سے سو روپے کا نوٹ چاندنی کو دیا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں اصرار کرنے لگا۔ چاندنی انکار کرتی رہی۔ بڑی مشکل میں نے وہ روپے چاندنی کو دیئے۔ اس کی نظر میرے بہترین نئے سوٹ اور چمکدار جوتوں پر پڑ چکی تھی۔ جو رمبھا نے خرید کر دیئے تھے۔ اور پھر وہ میرے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی اور کلائی پر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی"

"روپ بابو اتنے دن کہاں رہے۔ کہیں نظر نہیں آئے"

"پکچر ختم ہو چکی ہے۔ مجھے فرصت تھی۔ سوچا ایک دوست سے مل کر آؤں جو کئی دنوں سے خط پر خط لکھ رہا تھا کہ پونا چلے آؤ۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پونا چلے گئے تھے تم۔" چاندنی نے کہا۔

"ہاں پونا۔"

"جھوٹ نہ بولو روپ بابو۔ تم تو رمبھا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے پھر رہے ہو۔"

"تمہیں کس نے کہا؟"

"میں نے تمہیں اپنی آنکھوں سے اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھے دیکھا۔ وہ ہنس ہنس کر تمہارے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔"

"میں؟"

"ہاں تم۔"

"کوئی اور ہوگا۔"

"تمہاری آنکھوں نے تمہیں دھوکہ دیا چاندنی۔"

"میری آنکھیں تمہیں پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتی بابو۔ یہ تمہیں پہچاننے میں کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔" چاندنی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور پھر کلپنا نے مجھے تمہاری اور رمبھا کی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔"

"کونسی کلپنا؟"

" وہ جو تمہاری پکچر میں رمبھا کی سہیلی بنی ہے "

" اچھا وہ سانولی سی ادھیڑ لڑکی "

" وہی "

" کیا باتیں بتائیں اس نے تمہیں ؟ "

" ان باتوں کو چھوڑو بابو۔ میں یا کوئی اور تمہیں روکنے والا کون۔ تمہارے من کی موج ہے " چاندنی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" میں تم سے اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ رمبھا جتنی مشہور ہے اتنی بدنام بھی ہے۔ پھولوں کا رس چوسنے والی بھنورا عورت۔ تم پھول ہو بابو۔ وہ تمہارا رس چوس جائے گی۔ بابو وہ تمہیں فلموں میں کام کرنے کے قابل نہ چھوڑے گی۔ اور بابو میں تو بڑی آس لگائے بیٹھی ہوں تم پہ۔ مارکیٹ میں تمہارا نام ہو جائے گا تو تم میرے لیے بھی کچھ کر سکو گے " چاندنی بولی۔

اس کے جواب میں میں نے کہا۔

" میں یہ جو کچھ کر رہا ہوں اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے اچھے دنوں کو لانے کے لیے۔ یہ فلم انڈسٹری تو بڑی ظالم ہے۔ اس میں کہیں اندھیرا ہے کہیں اجالا۔ دولت کا اجالا۔ کامیابی اور شہرت کا اجالا۔ کہیں اندھیرا۔ بدصورتی اور بدکاری کا اندھیرا۔ مفلسی اور لاچاری کا اندھیرا۔ گمنامی اور ناکامی کا اندھیرا۔ کہیں فلم اسٹار دو

کو لاکھوں روپے بلیک میں ادا کیے جا رہے ہیں۔ کہیں ایکسٹرا اور اسٹوڈیو کے مزدوروں کو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو بھی نہیں ملتی۔ کہیں کوئی اپنا حسن بیچ رہی ہے۔ کہیں کوئی اپنی عقل اور ذہانت کا نیلام کر رہا ہے اپنے پیٹ کی خاطر۔ کہیں نئے چڑھتے ہوئے ستاروں کو آسمان پر چڑھایا جا رہا ہے۔ کہیں پرانے ڈوبتے ہوئے ستارے گمنامی کے اندھیرے میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ تم خود ہی اپنے آپ کو دیکھو۔ اپنی سہیلی رنجنا، کوثر اور اوشا کو دیکھو۔ کسی بھی ہیرو اور ہیروئن کو لے لو۔ سبھی نہ کسی راستے سے آگے بڑھے ہیں۔ کسی نہ کسی کے کندھے پر سوار ہو کر آگے بڑھے ہیں۔ جب آدمی اگلی سیڑھی پہ چڑھتا ہے تو پچھلی سیڑھی چھوڑ دیتا ہے۔ میرے لیے راج ایک سیڑھی ہی تو ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ عنقریب ہی وہ ایک فلم بنائے گی۔ جس میں ہم ان فنکاروں کو کام دیں گے جن کو کہیں کام نہیں ملتا۔ اگر وہ فلم پاس ہو گئی جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو گی ہم ایک فلم کمپنی کھول دیں گے۔ جو ہر فنکار کی اپنی کمپنی ہو گی۔ جہاں کسی کے ساتھ بھی کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو بابو۔ یہ تمہارا بڑا اچھا خیال ہے۔" چاندنی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"رمبھا بڑی چھوٹی عورت ہے۔ بڑی مکّار ہے۔ چھلیا ہے تمہیں چھل دے جائے گی۔ وہ تو پھولوں کی بس مہک اور رس چوسنا چاہتی ہے اُسے اُس کے پھلنے پھولنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تمہارے ساتھ تمھارے روپ رس کا سودا کر رہی ہے۔ ایسا اگر میں بھی چاہوں تو کر سکتی ہوں۔ یہاں ایسے کئی ہیں جو میرا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے کس کس چیز کا لالچ نہیں دیا گیا۔ مگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتی۔ اگر میری زندگی میں کوئی ایسا وقت بھی آگیا کہ مجھے بازار کے کسی فٹ پاتھ پر سبزی بیچنی پڑی تو بیچوں گی۔ کارخانوں میں کام کرنے جاؤں گی۔ لیکن اپنے آپ کو بیچوں گی نہیں۔ تم نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو چاندنی؟" میں نے کہا۔

"میں نے ابھی تک اپنے آپ کو نہیں بیچا ہاں۔ جیسے تم نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔ رمبھا کے لے کر دیئے ہوئے گیبرڈین کے سوٹ میں تم ہیرو نہیں مجھے ایک زنڈی دکھائی دے رہے ہو۔"

میں یکدم کانپ گیا۔ جیسے بھونچال کا جھٹکا آیا ہو۔ میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"چاندنی تم پاگل ہو گئی ہو پاگل!"

"ہاں۔ میں پاگل ہو گئی ہوں کہ آج تمہارے ساتھ کھلی کھلی باتیں کر رہی

ہوں۔ معاف کرنا بابو میری باتوں کا برا نہ ماننا۔ مگر ذرا سوچو تو سہی۔ ایک غریب مرد جو ایک امیر عورت کی دولت کی خاطر اس کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہے رنڈی نہیں تو کیا ہے ؟" اور یکدم مجھے ایک چکر سا آیا۔ چاندنی سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں راستہ بھول گیا تھا چاندنی۔ تم نے مجھے راستہ دکھا دیا۔ میں سو گیا تھا تم نے مجھے جگا دیا۔ واقعی میں ایک رنڈی بن چلا تھا لیکن تم مجھے میری بھول کے آئینے میں میرا چہرہ دکھا دیا۔ اب تم مجھے کبھی رمبھا کے ساتھ نہ دیکھو گی۔ ان اندھیروں میں راستہ بنانے کے لیے ہم نے کسی نہ کسی کی دولت کے دیئے نہیں اپنے لہو کے دیئے جلائے ہیں ؟" اور چاندنی کا چہرہ خوشی سے یکدم سرخ ہو گیا۔ بولی۔

"چلو تو میرے ساتھ گھر چلو۔ تمہیں ماتا جی بہت یاد کرتی ہیں۔ ان کی حالت بہت خراب ہے ؟" اور میں چپکے سے اس کے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے۔ کہ سڑک پر نیو ماڈل پیکارڈ آکر رکی اور آواز آئی۔

"روپ کمار"

میں نے جلدی سے گردن گھما کر دیکھا تو رمبھا تھی۔ اور میں بھیگی بلی کی طرح دبک گیا۔ نہ جانے کیا جادو تھا اس کی آنکھوں میں تو بس

بت بن کر رہ گیا۔

"دیکھو، ڈارلنگ تم بھی بڑے عجیب ہو۔ مجھ سے کہا میں ابھی آتا ہوں اور یہ وقت آگیا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں دیکھا۔ اب ایکسٹرا یونین کے دفتر سے ہو کر آرہی ہوں۔ بیٹھو گاڑی میں۔"

ایک ایکسٹرا لڑکی نے رمبھا کو بتایا تھا کہ میں اور چاندنی آپس میں محبت کرتے ہیں —— محبت —— جو مجھے چاندنی کے ساتھ اور چاندنی کو میرے ساتھ واقعی تھی۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے سے اب تک اس کا کبھی اظہار یا اقرار نہیں کیا تھا۔ بس کوئی چیز ہمارے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ جس کا دھواں ہم ایک دوسرے کی آنکھوں سے اٹھتا دیکھا کرتے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی چھو کر بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن رمبھا یہ سمجھتی تھی کہ میں اور چاندنی اب تک نہ جانے کیا کچھ کر چکے ہیں۔ مجھے ڈارلنگ کہہ کر پکارتے ہوئے رمبھا نے شاید چاندنی پر شاید طنز کی تھی۔ اس کے دل پر چنگی بھری تھی۔ میں نے رمبھا سے کہا۔

"میڈم تم چلو۔ میں ذرا چاندنی کی ماتاجی کی خبر لے آؤں۔ وہ بہت بیمار ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر پہلے تمہیں میرے ساتھ ادھر کلب میں چلنا ہوگا۔ میں نے راجکماری اندرا اور سیٹھ مراری جی کو ٹائم دیا ہوا

ہے۔ بیئر اور فلاشس کا ہلکا پھلکا پروگرام۔"

اور وہ مسکرانے لگی۔

"میں سمجھ گیا مگر ـــــــــ"

"مگر وگر کچھ نہیں مسٹر۔ تم بس چپکے سے ادھر سرک آؤ۔ بیٹھو۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔" رمبھا نے کسی قدر تلخ اور شیریں ملے جلے لہجہ میں کہا۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ میری زبان جیسے گونگی ہو گئی۔ میری ٹانگوں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال کر گاڑی کی طرف کھینچا۔ مجھے یہ یاد بھی نہ رہا کہ میں نے ابھی ابھی چاندنی کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے آئندہ کبھی رمبھا کے ساتھ نہ دیکھے گی۔ میں ایک کاٹھ کے اُلو کی طرح رمبھا کے پاس اگلی سیٹ پر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جادو اپنا کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ چاندنی بھی میرے ساتھ ہے۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی۔ آگے بڑھی تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ چاندنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ ٹھنڈے سانس لے رہی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ مگر میری نظر دھندلا گئی۔ جادو اپنا کام کر رہا تھا۔

اڑن کھٹولا

گاڑی اڑن کھٹولے کی طرح جا رہی تھی۔ رمبھا نے میری آنکھوں میں اپنی مسکراتی ہوئی آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم بڑے فراڈ آدمی ہو۔ اب میں تمہیں ایک پل کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے پرے نہ ہونے دوں گی۔ ایسا نہ ہو تم کہیں ڈبکی لگا جاؤ ورنہ میری زندگی کو حرام کر دو۔ روپ بابو میں تمہارے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم نے مجھے نہ جانے کیا کر دیا ہے۔"

جس طرح شہد کی مکھیوں کی رانی مکھی اپنے آپ کو موم محل میں بند کیا،

بیٹھ جاتی ہے۔ رمبھا مجھے اپنے ایک کمرے میں بند کرکے بیٹھ رہی۔ کوٹھی کے دروازے پر اس نے ایک پٹھان پہرے دار بٹھا دیا کہ مجھے کوٹھی سے باہر نہ نکلنے دے اور کسی غیر کو کوٹھی میں نہ آنے دے چاہے اس کی جان چلی جائے۔

پہلے تو پورے آٹھ دن رمبھا کی حالت بالکل پاگلوں کی طرح رہی۔ اس کے جذبات کے سمندر میں جوار بھاٹا آرہا تھا۔ وہ مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ ان آٹھ دنوں میں وہ اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ اس نے کمرے میں سٹوو منگوا لیا تھا۔ وہ میرے لیے مرغ بھونتی۔ بٹیر بھونتی۔ وہ بہت اچھا گوشت پکاتی تھی۔ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں رہتی اور مجھے بھی نشے میں رکھتی۔ اس عرصہ میں کئی پروڈیوسر، کئی سیٹھ، کئی ہدایت کار اس سے ملنے آئے لیکن وہ کسی سے نہ ملی۔ اس کی طبیعت کے علیل ہونے کا عذر پیش کرکے سب کو کوٹھی کے دروازے ہی سے لوٹا دیا گیا۔ کسی کی ملاقات نہ ہو سکی۔ معلوم ہوتا تھا وہ مجھ پر کچھ ایسی مرمٹی ہے کہ کسی دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور تو اور اس کے باپ بابو برکت علی کو بھی اس کے کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

کسی ریاست کے بڑے شوقین اور رنگیلے ایک نواب صاحب بھی

رمبھا کے پروانوں میں سے تھے۔ اور ابھی تک ویٹنگ لسٹ میں تھے۔ اپنی بدصورتی کی وجہ سے۔ وہ ہر وقت منہ میں پان رکھتے تھے۔ ہر وقت پیک گھولتے جاتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے منہ سے ببلے چھوڑتے جاتے۔ ایک دن وہ آٹپکے۔ رمبھا کا باپ نشہ پانی کر کے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ نواب صاحب کی گاڑی کو پٹھان نے دروازے پر روک لیا۔ اندر جانے کی اجازت نہ دی تو نواب صاحب نوابی کے زعم میں گرجنے لگے۔ بابو برکت علی جلدی سے اُدھر گیا۔ دیکھا تو نواب صاحب تھے۔ سلام عرض کیا۔ نواب صاحب کہنے لگے۔

"یہ کیسا بدتمیز چوکیدار رکھا ہوا ہے تم نے"

بابو برکت بولا۔

"حضور وہ رمبھا کی طبیعت ٹھیک نہیں ملنے والے پریشان کرتے ہیں۔ یہ پابندی اس لیے ہے۔"

"کیا ہے رمبھا کی طبیعت کو؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"ایک سو تین بخار ہے" بابو برکت علی نے کہا۔

"میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں"

"وہ اس وقت سو رہی ہے"

"اچھا تو میں اس کے اُٹھنے تک انتظار کرتا ہوں"

"نہیں حضور۔ ملاقات سے منع کیا ہے ڈاکٹر نے۔"

"مجھے ملنے کی اجازت دے دو۔ تمہیں وہسکی کی ایک بوتل دوں گا۔"

"میں تو آدمی پر ہی راضی ہو جاتا مگر وہ بیماری میں ملاقات نہیں کر سکتی۔"

"چلو تو دو وہسکی کی دو بوتلیں۔" نواب صاحب بولی بڑھا رہے تھے۔

"اچھا تو نواب صاحب آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر پہلی بوتل گھونٹ گھونٹ شروع کرتے ہیں۔ اتنے میں اگر وہ جاگ گئی تو آپ کی ملاقات کرا دوں گا۔"

نواب صاحب مان گئے۔ نواب صاحب نے وہسکی کی پہلی بوتل کا کاگ اڑایا۔ دونوں پینے لگے۔ نواب صاحب ہزلیات کے بڑے شوقین تھے۔ گندی غزلیں اور شعر محفل میں بیٹھ کر سناتے تھے۔

"نواب صاحب آج کوئی شعر وغیرہ نہیں سنائیں گے آپ؟"

اور نواب صاحب نے ایک عریاں غزل شروع کر دی۔ امساک کی گولیاں۔ عریاں پوسٹ کارڈ۔ لملا۔ کوک شاستر۔ غزل ختم ہونے تک وہسکی کی پوری بوتل ختم۔ نواب صاحب بولے۔

"جاؤ دیکھو بابو۔ رنجا جاگ گئی ہے؟"

اور بابو جی گاڑی سے نکل کر اُدھر ایک کمرے میں جا گھسے۔ اس کی بند کھڑکی کے شیشے سے دیکھتے رہے کہ نواب صاحب اس کے پیچھے تو نہیں چلے

گئے ۔ تھوڑی دیر بعد بدحواسی اور بوکھلاہٹ میں برکت بابو نواب صاحب کے پاس گئے بولے۔

" رمبھا کی طبیعت تو زیادہ خراب ہو گئی ہے ۔ آپ پھر کسی وقت تشریف لائیں "

نواب صاحب شراب کے نشے میں بابو برکت کو رمبھا کو آپ کو گندی گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے ۔ اور بابو برکت اس کمرے کے پاس چلا آیا ۔ جس کے اندر پنڈت جی اور رمبھا بیٹھے پی رہے تھے ۔ دروازہ بند تھا بھٹ پھٹ دروازہ کھٹکھٹایا۔

" کون ہے ؟" رمبھا نے پوچھا ۔

" پنڈت سورج گرہن چاند گرہن آئے ہیں ۔ باہر سے بابو برکت نے کہا۔

" لعنت بھیجو " اندر سے رمبھا نے آواز دی ۔

" دروازہ کھولو "

" میں کہتی ہوں ڈسٹرب نہ کرو "

" کیا کہا ؟"

" پریشان نہ کرو "

" پنڈت جی مجھے پریشان کر رہے ہیں "

"دکھشنا دے کر اُسے چلتا کرو۔"

"پیسے ادھر سرکاؤ۔"

"اچھا" رمبھا نے کہا۔ اور بٹوہ کھول کر دس دس کے تین نوٹ نکالے۔ اور دروازے کے نیچے سے باہر سرکا دیئے۔ اس دن ہم شمپین پی رہے تھے۔ اور بڑا لطف آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اڑن کھٹولے میں بیٹھا ہوں اور خدا کے نیلے نیلے آسمان کی سیر کر رہا ہوں۔ اور اڑن کھٹولا اُوپر ہی اوپر آسمان میں اٹھتا چلا گیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ انہی رنگ رلیوں میں ایک مہینہ۔ دوسرا مہینہ ——تیسرا مہینہ گزر گیا۔ اور پھر چوتھا مہینہ —————— اب تو اُس کوٹھی میں اُس کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

"کھڑکی کھول دوں ڈارلنگ" ایک دن رات کے وقت کمرے میں ذرا گھمس ہو گیا تو رمبھا نے کہا۔

"سر دکھ رہا ہے میرا" میں نے کہا۔

"سر دباؤں ڈارلنگ"

"نہیں اب تو ذرا اس کوٹھی سے باہر نکل کر گھومنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اکتا گئے مجھ سے؟"

"نہیں ڈارلنگ۔ پورے چار مہینے ہو گئے ہیں ہمیں اس کوٹھی اس

گرے میں بند ہوئے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تو ایک لمحہ بھی نہیں ہوا ڈارلنگ۔" رمبھا نے میرے رخسار سے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

"رات کتنی حسین ہے۔ اور میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتی ہوا۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ زندگی نام ہے پینے اور پلانے کا۔ پیار کرنے کا۔ سپنوں سے بھری ہلکی ہلکی موسیقی سننے کا۔ ایک نئے جسم کی پکار سننے کا۔ نازک نازک بانہوں کی گولائی میں اپنے آپ کو قید کر لینے کا۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔"

وقت یونہی گزرتا چلا گیا۔ میں اڑن کھٹولے کی سیر کرتا رہا۔ ایک مہینہ اور گزر گیا۔ پورے چھ مہینے۔ رمبھا نے میرا حلیہ بگاڑ دیا۔ میرے رخساروں میں کھلے ہوئے گلاب پیلے پڑ گئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوتا تو مجھے چکر آنے لگتے۔ میری حالت بڑی خراب ہو گئی۔ دو قدم چلتا تو سانس پھول جاتا۔ دل تیز تیز دھڑکنے لگتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ مجھے دل کے دورے پڑنے لگے۔ دورہ پڑتے ہی میں ٹھنڈا ہو جاتا اور مجھے یوں معلوم ہوتا جیسے ابھی میرا دم نکل جائے گا۔ دل بند ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں بھی رمبھا مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیتی تھی۔ ایک دن تو میرا برا حال ہوا۔ پنگ خالی کرتے ہی مجھے بڑے زور کا چکر آیا۔ اور میں چکرا کر پلنگ پر گر گیا۔ سانس اکھڑ گیا۔ پسینے چھوڑ گئے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے

ہو گئے - آنکھیں مندھ گییں - رمبھا نے جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا - تھوڑی دیر میں وہ آیا - میرا معائنہ کیا - مجھے انجکشن کرنے کے بعد یہی مشورہ دیا کہ مجھے فوراً ہسپتال پہنچا دیا جائے ۔

اور رمبھا مجھے اپنی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال چھوڑ گئی - جہاں میری حالت اور زیادہ خراب ہو گئی - مجھے آکسیجن دی گئی - تو میری حالت کچھ سنبھلی - رمبھا دو چار روز میری خبر لینے آتی رہی اور پھر ایسی غائب ہوئی کہ اپنی شکل بھی نہ دکھائی - میں بڑی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہا تھا - میں نے شاف نرس سے کہا سنی ویو میں رمبھا کو رنگ کرے - نرس بیچاری اچھی تھی - اس نے سنی ویو فون کیا تو معلوم ہوا رمبھا ڈیرہ ڈون سیر و سیاحت کے لیے چلی گئی ہے - رمبھا کے خانساماں کے ساتھ میرے اچھے تعلقات پیدا ہو چکے تھے - بھلا آدمی تھا - مجھے بڑا اچھا سمجھتا تھا - میں نے نرس کے ذریعے اسے فون پر یہ پیغام بھیجا کہ وہ مجھے کیسے بھی ہو کسی وقت ہسپتال میں ملے - وہ اسی دن مجھے ہسپتال میں آکر ملا - تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ رمبھا ایک اور خوبرو لونڈے کے ساتھ ڈیرہ ڈون جا چکی ہے - اور معلوم نہیں کب آئے گی - اور میری نظروں دنیا اندھیر ہو گئی - میرے کانوں میں چاندنی کی آواز گونجنے لگی -

"بھونرا عورت - یہ تمہارا روپ - رس چوس کر اڑ جائے گی"

—میری حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے خون کی ضرورت تھی۔ اور ایسے خون کی جو میرے خون کے گروپ کا ہو۔ اور ہسپتال کے بلڈ بنک میں خون کی بڑی قلت تھی۔ لوگ اپنے بیماروں کو اپنا خون دیتے تھے۔ اور جن کا خون مریض کے خون سے نہ ملتا تھا بلڈ بنک سے خون خرید کر اپنے مریضوں کو دیتے تھے۔ جو بہت مہنگا ملتا تھا۔ لیکن میرا کون تھا۔ وہاں جو مجھے اپنا سمجھتے ہوئے اپنا خون دیتا۔ اور اگر اس کا خون میرے خون سے نہ ملتا تو میرے لیے ہسپتال کے بلڈ بنک سے خون خریدتا۔

ایسی حالت میں میں نے منٹو سے رجوع کیا۔ رمبھا کے خانسامے سے جو اب میری خبر لینے آجاتا تھا، کہا کہ وہ جا کر منٹو سے ملے۔ اور صورت حال سے آگاہ کرے۔ وہ میرے کہنے پر منٹو صاحب کی قیامگاہ پر پہنچا۔ لیکن وہ ابھی تک لاہور میں تھے۔ اور بمبئی واپس نہ آئے تھے۔

اب میں نے اپنے دوست اعجاز کا پتہ دے کر خانسامے کو بھنڈی بازار بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی کام کاج چھوڑ چھاڑ کر بمبئی سے جا چکا ہے۔ امید کی آخری کرن بھی مٹ چکی تھی۔ اسی اثنا میں مجھے کئی بار چاندنی کا خیال آیا۔ مگر میں نے اس دن اس کے ساتھ جو سلوک کیا مجھے بھولا نہ تھا۔ میں اس کی ماتا کی اتنی خراب حالت میں اس کی خبر

یلنے رہ گیا تھا۔ بھلا وہ میری خبر لینے کیوں آئے گی۔ میں ہسپتال میں ایک بیڈ پر پڑا موت کا انتظار کرنے لگا۔

موت ——— جو مجھے یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے دبے دبے پاؤں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہے۔ موت ——— جس کی شکل بالکل رمبھا سے ملتی جلتی تھی۔

سائن

ہسپتال

میں

پھول اور بھونرے کی کہانی۔

میری اور رمبھا کے پیار کی یہ دردناک کہانی چند فلمی پرچوں میں بھی شائع ہو چکی تھی۔ ان پرچوں کے نامہ نگاروں کے بیباک قلم نے میرے اور رمبھا کے اس معاشقے جو لفظی تصویر کھینچی تھی، اس نے ہزاروں فلم فینوں کو چونکا دیا تھا۔

یہ کہانی چاندنی کی نظروں سے بھی گزری تو وہ یہ پڑھ کر بے چین ہو گئی کہ میں ہسپتال میں ہوں اور مر رہا ہوں۔ بعد ازاں مجھے اس کی سہیلی

کلپنا سے معلوم ہوا کہ اس کا چہرہ یہ خبر پڑھتے ہی یکدم پیلا پڑ گیا۔ چاندنی نے اتنے زور سے سانس اندر کھینچی کہ اس کے حلق سے کسی زخمی پنچھی کی چیخ نکل گئی۔ کلپنا نے اُسے سہارا دیا۔ بولی

"کہاں ہے وہ؟"

"سائن ہسپتال میں۔ چاندنی نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"سائن میں۔ جہاں پہلے کبھی ملٹری کی بارکیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کو جنرل ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کلپنا نے پوچھا۔

"میں نے فلمستان میں پڑھا ہے" چاندنی نے اتنا کہا اور چل دی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" کلپنا نے پوچھا۔

لیکن چاندنی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بستی کی گلی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہاں سے کہیں بھاگ کر کہیں تیز تیز چلتے ہوئے وہ بائی کلہ برج تک پہنچی۔ پُل کے بس اسٹینڈ تک پہنچنے پر اس کا دم پھول گیا۔ اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی جسمانی تکلیف کا کوئی خیال نہ کیا۔ وہاں سے اُس نے سائن جانے والی تیز رفتار بس پکڑی۔ اس میں بیٹھ کر وہ سائن ہسپتال کے ناکے پر اتر گئی۔ اور مین گیٹ سے سیدھی چلی آئی۔ کچھ عرصہ تو ڈاکٹروں اور نرسوں

سے پوچھنے میں گزر گیا۔ آخر ایک نرس نے اُسے بتایا۔

"روپ کمار کو اس وقت تک کافی خون دیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی اُسے مزید خون دینے کی ضرورت ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ اس کے گروپ کا خون بلڈ بنک میں موجود نہیں۔ اور کوئی اس کا ایسا بھی تو نہیں جو خون بیچنے والوں کو رقم دے کر اس کے لیے اس کے گروپ کا خون خرید سکے۔"

"میں رُوپ کمار سے ملنا چاہتی ہوں۔" چاندنی نے کہا۔

"اس کے لیے میں اپنا خون دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"تم اُسے ضرور مل سکو گی لیکن مریضوں سے ملاقات کا وقت ساڑھے چار بجے ہے۔" نرس نے کہا۔

ساڑھے چار بجے۔ اور ابھی اس میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ چاندنی باہر پورچ میں وقت کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ ہر طرف فینائل اور پٹیوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ ہر چیز پر ایک اُداس سی خاموشی چھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کئی لوگوں کے ہاتھوں میں پھول اور پھل تھے۔ چاندنی نے سوچا وہ اُس کے لیے کچھ نہیں لائی۔ اس لیے کہ اس کی جیب میں اتنے پیسے ہی نہ تھے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ وہ میرے لیے اپنے خون کا تحفہ لے کر آئی ہے۔ جس کے بعد کسی تحفے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور یہی وہ تحفہ تھا جس کی مجھے

اس وقت ضرورت ہے۔

ملاقات کا وقت ہو گیا تو چاندنی پونا بلاک کے ڈی وارڈ میں داخل ہوئی جہاں میں داخل تھا۔ بیڈ نمبر پانچ۔ ہسپتال میں ملاقات کے وقت کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اور بچے، عورتیں، مرد، مائیں، بھائی باپ اور بہنیں، دوست اور رشتہ دار مریضوں کو دیکھنے کے لیے مختلف وارڈوں میں گھسے چلے آ رہے تھے۔

چاندنی بھی جلدی سے ڈی وارڈ میں گھس گئی۔ وارڈ کے اندر مریض اپنے اپنے بیڈ پر بیٹھے ملاقاتیوں سے مل رہے تھے۔

چاندنی ایک بار سارے وارڈ کا چکر لگا کے گھوم گئی۔ اُسے میں کہیں دکھائی نہ دیا۔ دوسری بار وہ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر ایک بیڈ کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے سٹاف نرس کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اُس سے پوچھے میں کہاں ہوں۔ بیڈ نمبر پانچ کہاں ہے۔ لیکن میں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا اے کاش میرا بھی یہاں کوئی ہوتا جو مجھے ملنے آتا۔ چاندنی کو دیکھتے ہی بیساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"چاندنی"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ جس کا اس وقت حلیہ ہی

بگڑ رہا تھا۔ پیلی رنگت۔ گالی اندر کو دھنسے ہوئے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے۔ چاندنی نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"روپ کمار"۔ ایکا ایکی اس کے ہونٹ ہلے۔

"روپ کمار!" چاندنی کی چیخ نکل گئی۔ اور آس پاس کے مریض اور ان کے ملاقاتی چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

"شیش شیش۔ غل نہ کرو۔" اُدھر سے نرس نے کہا۔

اور چاندنی لپک کر میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے سب کے سامنے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میرا ماتھا چوما۔ پچکے ہوئے رُخسار چومے۔ اور اس نے آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کے بیچ کہا۔

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی روپ بابو۔ میں تمہیں اپنے خون کا آخری قطرہ تک دیتے ہوئے تمہاری موت سے لڑوں گی۔ تمہیں زندہ رکھنے کی کوشش کروں گی۔ اپنی ساری زندگی تمہیں دے دوں گی۔"

اور میرے دل میں بجھتا ہُوا زندگی کا شعلہ پھر بھڑکا۔ چاندنی کا سہارا پاکر میری زندگی کی گرتی ہوئی دیوار ٹھہر گئی۔

"مجھے معاف کردو چاندنی۔ میں تمہاری ماتاجی کی خبر لینے نہ گیا۔ اور ریکھا کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے وعدہ کیا اور توڑ دیا۔ میں نے تمہاری بات

ہزمانی اور نقصان اٹھایا۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔"

"جو کچھ ہو چکا اُسے بھول جاؤ بابو۔ بالکل بھول جاؤ۔ آنے والے وقت کی باتیں کرو" چاندنی نے کہا۔

"کہو تمہاری ماتا جی کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو اسی دن چل بسی تھیں۔" چاندنی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اور مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ آنسو جواب تک میری پلکوں کے پیچھے رکے ہوئے تھے۔ پھوٹ نکلے۔ ہم دونوں کافی دیر گردن جھکائے چپ چاپ نہ جانے کن خیالوں میں کھوئے رہے۔

"اب تم کہاں رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی بلڈنگ میں۔ اسی کمرے میں۔" چاندنی نے جواب دیا۔

"اکیلی؟"

"ہاں اکیلی۔"

"تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟"

"جالندھر میں ہیں۔"

"ان کے پاس چلی جائیں۔"

"اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں بابو۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"یہ دنیا اکیلی عورت کے لیے خطرناک ہے بھی چاندنی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ مگر میں نے اب تک ہر خطرے کا مقابلہ کیا ہے۔ ہر خطرے کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔ عورت اگر پھول ہے تو پتھر بھی ہے۔ وہ ایک تیز کٹار بھی ہے۔ وہ اپنی حفاظت خود آپ کر سکتی ہے۔ وہ اگر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لے تو اسے کوئی چیز نہیں ڈرا سکتی۔"

"چاندنی تم دیوی ہو دیوی" ۔ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نتھرے ستھرے پانی پر تیرتا کنول ہو۔ اور دیکھو چاندنی ہر عورت ہر مرد کو اس جیون میں ایک سچے ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ بے مزہ ہے۔ بے معنی ہے۔ تمہیں اب تک اپنا کوئی جیون ساتھی ڈھونڈ لینا چاہیئے تھا۔"

"میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔"

"وہ کون ہے۔ وہ کون ہے؟"

مگر چاندنی نے مجھے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اس کی خاموشی اور پاکیزہ محبت جو بات زبان سے نہ کہنا چاہتی تھی۔ میرا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے اس کا اظہار کر دیا تھا۔

"مگر۔ مگر۔ ہمارے درمیان ایک دیوار کھڑی ہے چاندنی!"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کونسی دیوار؟" چاندنی نے پوچھا۔

"مذہب کی۔" میں نے کہا۔

"انسانیت کا دھرم۔ انسانیت کا مذہب تو پیار ہے بابو۔ سچا پیار۔ پوتر پیار۔ ہمارا دھرم۔ ہمارا مذہب تو فقط پیار ہے۔ ہم دونوں نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ ہمارا دھرم تو بس پیار ہے۔ ہم دونوں انسان ہیں۔" چاندنی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس بات کو چھوڑو۔ تم مجھے یہ بتاؤ تم نے مجھے خبر کیوں نہ کی کہ تم ہسپتال میں ہو۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اپنا مکروہ چہرہ دکھاؤں۔"

"کیوں؟"

"کہہ نہیں سکتا۔" میں نے اپنا دل ٹٹولتے ہوئے آہستہ آہستہ رکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اتنی خواہش ضرور تھی میری کہ جب مر جاؤں تو لاش تمہارے حوالے کر دی جائے۔"

"کیوں؟"

"سوچتا تھا کہ جس عورت نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ مرنے کے بعد میری لاش کو نہ جانے کہاں تک پہنچائے گی۔ جو میری زندگی میں مجھ سے چھپتی پھرتی ہے۔ میری موت کی خبر سن کر تو یہ شہر ہی چھوڑ

جائے گی۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔"

"وہ تو مجھے بالکل مردہ سمجھتی تھی۔ جیسے بس گھڑی پل میں مرا کہ مرا۔ مگر میں ابھی تک زندہ ہوں۔ اور شاید زندہ رہوں۔"

"تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ میں تمہیں اپنے پیار کا دان دے رہی ہوں۔ میں تمہیں اپنا لہو دے رہی ہوں۔ میں تمہیں مرنے نہ دوں گی۔"

چاندنی کے لہجہ میں عزم، اعتماد اور پیار کی آگ تھی۔ وہی آگ جو ہر زندہ چیز میں موجود ہے۔

یکا یک ہسپتال کے وارڈوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ چاندنی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں کل پھر آؤں گی۔ ہر روز آتی رہوں گی۔ گھبراؤ نہیں۔ تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔"

اور وہ اٹھ کر چل دی۔ وارڈ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے مجھے گھوم کر دیکھا۔ میں برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مجھے نرس نے بتایا کہ چاندنی نے اس دن میرے لیے اپنا خون دیا۔ وہ وارڈ سے اٹھ کر سیدھی بلڈ بینک میں پہنچی۔ اور میرے

لیے خون کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کیا۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ آیا اس کا خون میرے خون سے ملتا بھی ہے کہ نہیں۔ پہلے ذرہ سا خون لے کر ڈاکٹر لوگ لیبارٹری میں چاندنی کے خون کا تجزیہ کر رہے تھے۔ اور چاندنی بڑی بے قراری سے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے یہی ادھیڑبن لگی ہوئی تھی کہ اس کا خون میرے خون سے مل جائے۔

وہ بھگوان سے یہی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اور بھگوان نے اس کی دعا سن لی۔ تجزیے میں اس کا خون میرے خون سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ اُسی گروپ کا۔ ڈاکٹروں نے مجھے دینے کے لیے چاندنی کا خون نکال لیا۔

اور اسی دن رات کو میری حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ مجھے اپنی آنکھیں بے نور سی نظر آنے لگی تھیں۔ ہر چیز دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگی تھی۔ میں خاموش بیڈ پر لیٹا تھا۔ مجھے چاندنی کا خون دیا جا رہا تھا۔

آدھی رات گئے چاندنی نہ جانے کیسے نہ جانے کس طرف سے سائن ہسپتال کی دیوار پھاند کر اندر گئی۔ اور وہاں سے ڈی وارڈ میں گھس

آئی - نرس نے اس کو دروازے پر روک دیا. لیکن تھی وہ جذباتی لڑکی - شاید کسی سے پیار کرتی تھی - پیار کے درد کو خوب جانتی تھی - چاندنی نے اُسے پیار کی کہانی سنائی - اس کی منت سماجت کی تو نرس مان گئی - اس نے چاندنی کو اجازت دے دی کہ جب تک اس کی ڈیوٹی ہے - چاندنی بیشک میرے پاس رہے - اس نے چاندنی سے کہا -

" جب تک میری ڈیوٹی ہے تم کسی بات کا فکر نہ کرو - اپنے پریمی کے پاس بیٹھی رہو - اور جب دوسری نرس ڈیوٹی پر آئے گی - میں اُسے جاتی ہوئی بول جاؤں گی - وہ بھی تمہیں اس وارڈ سے باہر نہیں نکالے گی میری ڈیوٹی صبح تک ہے " -

اسٹینڈ پر کانچ کی ٹوٹیوں سے چاندنی کا خون قطرہ قطرہ میرے جسم میں پہنچ رہا تھا - اور وہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی - وہ ساری رات میرے پاس بیٹھی رہی - میری دیکھ بھال کرتی رہی - مجھ سے باتیں کرتی رہی - کوڑی کوڑی کر کے چاندنی نے تین سو روپے جمع کیے تھے - اور ان کی سونے کی دو خوبصورت چوڑیاں بنالی تھیں - صبح ہوتے ہی وہ صرافے بازار گئی اور چوڑیاں بیچ باچ کر دو سو روپے

لے آئی۔ وہ مجھے جنرل وارڈ میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ نرس نے اُسے بتایا تھا کہ اسپیشل روم کے لیے سات روپے روزانہ کرایہ دینا پڑے گا۔ اس نے دس دن کا کرایہ ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ جہاں وہ ہر وقت میرے پاس میرے ساتھ رہ سکتی تھی۔ مَیں جنرل وارڈ سے اسپیشل روم میں آگیا۔ یہ تو اب پرائیوٹ وارڈ کا کمرہ تھا۔

اور یہ کمرہ میرے لیے بڑا نیک فال ثابت ہوا۔ جب میں یہاں سٹریچر پر پہنچایا گیا نہ جانے کسی اچھی گھڑی تھی کہ میری حالت لمحہ بہ لمحہ بہتر ہونے لگی۔ چاندنی بولی۔

"بابو اب تم ٹھیک ہوتے جا رہے ہو۔ تمہارے چہرے کے پیلے رنگ میں سُرخی جھلکنے لگی ہے"۔

"یہ سب تمہارے خون کا کرشمہ ہے۔ تم نے اپنے لہو کا دان دے کر مجھے بچا لیا ہے۔ اب میں زندہ رہوں گا۔" میں نے کہا۔

"تم کو زندہ ہی رہنا ہوگا۔ اپنے لیے۔ میرے لیے۔ تم کو زندہ ہی رہنا ہوگا بابو" چاندنی نے کہا۔

"ہاں میں تمہارے لیے زندہ رہوں گا۔ تمہارے لیے زندہ رہوں گا" میری انگلیاں چاندنی کی انگلیوں سے کھیلنے لگیں۔

اور ہم دونوں بھولی بسری یادوں میں کھو گئے۔

"چاندنی کیا تمہیں میرین ڈرائیور کی سیر یاد ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں یاد ہے" چاندنی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"گیٹ آف انڈیا سے ہم چوپاٹی گئے تھے۔ وہاں ہم نے کھٹی میٹھی چاٹ کھائی تھی۔ پھر وہاں سے ہم لوٹ گئے تھے"

"اور پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھنا۔ بارش کا برسنا اور دھیرے دھیرے ٹیکسی کا میرین ڈرائیور کی طرف چلے جانا۔ تم میرے پہلو میں بیٹھی تھیں" میں نے کہا۔

"اور وہ دھند" چاندنی نے آہستہ سے کہا۔

"بڑی پراسرار تھی۔ جو کئی مہینوں نیندوں پر چھا رہی۔ میرے سپنے چمگادڑوں کی طرح اس میں پھڑپھڑاتے رہے۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ مجھے ایک اڑن کھٹولا سی عورت اڑا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ جادوگرنی۔ جس کے جادو نے مجھے مکھی بنا کر اس کے جسم کی چکنی اور بڑی چمکدار دیوار سے چپکائے رکھا۔ اور پھر کئی دن کئی راتیں گزر گئیں۔ میں جن لمحوں کو اپنی زندگی کے رنگین لمحے سمجھتا تھا میری زندگی کے بڑے ہی تاریک لمحے تھے جنہوں نے مجھے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیا۔ اور ایسے کئی لمحے دھند کی طرح میری زندگی پر سے گزرتے چلے گئے۔ مگر میں جادو کے زور سے مکھی بنا رہا۔ لیکن تمہارے پیار کے لمس نے اس جادو کو توڑ دیا ہے۔ میں نے محسوس

کیا ہے کہ میری زندگی کا سب سے مقدس سب سے روشن اور مہکتا ہوا لمحہ وہ ہے۔ جس میں تم نے مجھے اپنا لہو دان دیا۔ وہ لمحہ ہمیشہ میرے لہو میں زندہ رہے گا۔ مہکتا رہے گا۔ روشن رہے گا۔ میں ایک دیپ ہوں۔ اور تمہارا لہو اس کا تیل ہے۔ چاندنی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ساری زندگی تمہارے چرنوں میں گزار دوں گا۔ تم میرے من مندر کی دیوی ہو۔ میں ہمیشہ تمہاری پوجا کرتا رہوں گا۔"

میرے چہرے پر ایک نحیف سی مسکراہٹ آئی۔ اور میں تھک کر تکیے پر جا گرا۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق گو میری حالت اب خطرے سے باہر تھی لیکن نقاہت و کمزوری ابھی اتنی تھی کہ اٹھنے کے لیے کئی مہینوں کی ضرورت تھی۔ میں چاندنی کے سینے سے لپٹ گیا۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمڈ آئے۔

"میری دیوی۔ تم نے مجھے نیا جنم دیا ہے۔ نیا جنم دیا ہے۔"

"کدھر ہے وہ بنڈل بابو۔ بوگس بابو۔ اپنی اُس کو یکدم دیکھنا مانگتا۔"

ایکا ایکی کمرے کے باہر رمجو بنڈل عرف پرنس آف چوپاٹی کی آواز سنائی دی۔ جو میں نے پہچان لی تھی۔

"اس کمرے میں۔ سیٹھ جی اس کمرے میں۔" یہ نرس کی آواز تھی۔ اور اسی لمحے رمجو دادا کمرے میں داخل ہوا۔ جو دادا نہیں اس وقت

سیٹھ معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ جیل سے نہ آ رہا ہو کسی پیلیس سے آ رہا ہو۔ پاؤں میں پیٹینٹ شو۔ بوسکی کا تنگ چوڑی دار پاجامہ کمخواب کی شیروانی اور اس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ سر پر کمخواب کی دو پلی ٹوپی۔ کانوں میں پلاٹینم کے رنگ۔ ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں۔

"کدھر ہے بنڈل بابو۔ بوگس بابو۔ اپن اس کو دیکھنا مانگتا۔" رجو دادا نے پھر وہی جملہ دہرایا۔

"رجو دادا۔ میرے دوست" میرے منہ سے بےساختہ نکل گیا۔ میں چاندنی کا سہارا لے کر اٹھا۔ اور دادا کے سینے سے لگ کر رونے لگا۔ اور اس کے فوراً ہی بعد میں نے دادا کے آنسو بھی اپنے مرجھائے رخساروں پر پٹ پٹ گرتے محسوس کیے۔ ایک چلتا پھرتا زندہ پتھر بھی رو رہا تھا۔ کون کہتا ہے موالی انسان نہیں ہے۔ کون کہتا ہے کسی کو دیکھ لیں دیکھ کر اس کا دل تیز تیز نہیں دھڑک سکتا۔ اور اس کے دل کی ہر دھڑکن ایک آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے نہیں ٹپک سکتی۔

"اپن بنڈل تھا۔ پر تم گھامڑ بابو اپن سے بڑا ستی بنڈل نکلا۔ سالی ایک بھونرا عورت کی محبت میں تم سالا یکدم اتنا ڈیپ چلا گیا کر

تمہارا وجود ہی ٹیسٹ ہو گیاں۔ سالا یہ دیوی نہ ہوتا تو تم سالا شینٹی فلیٹ ہو گیاں تھا۔" دادا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

• اپن ساوا کو منگو دادا سالا نے سارا اسٹوری سنایا۔ پھر سالا تم نے اس کے ساتھ بھی گڑبڑ کیا۔"

• دیکھو دادا مجھے اس جادو گر عورت کے پیار نے یکدم اندھا کر دیا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ منگو دادا مجھے رمبھا کی کوٹھی سنیچیو میں ملنے آیا تو میں نے اس کی بے عزتی کی۔ میں نے کہا۔

• اپن کو سب اسٹوری سنایاں منگو دادا نے۔ تم سالا اس کے ساتھ گڑبڑ نہ کرتا تو اس گڑبڑ میں تمہارا ہیلپ کرتا۔" دادا نے کہا۔

• ہاں دادا میں نے اس جادوگرنی کے جادو سے پاگل ہو کر اپنے دوست بھی اپنے دشمن بنا لیے۔" میں نے کہا۔

"تم سالا ٹھیک بولتا ہے۔ اپن نے منگو دادا کا اچھی طرح کان کھینچا۔ بولا۔ سالا تم اپن کے دوست کا ہیلپ ناہیں کیا۔ اپن سالا تمہاری چھیڑی میٹ کرے گا۔ وہ سالا معافی مانگتا پڑا۔" دادا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

• سالا یہ دیوی ناری نہ ہوتا تو تم سالا کا بیان نکل جاتا۔ ڈھری تخت۔

سیدھا قبر کے گڑھے میں جا آں ۔"

• ہاں دادا ۔ چاندنی نے مجھے اپنے لہو کا دان دے کر بچا لیا ہے ۔ میں آج چاندنی کی وجہ سے زندہ ہوں ۔

"چاندنی دیوی ہے" میں نے کہا ۔

اور دادا نے چاندنی کے چرنوں کی دھول اٹھا کر اپنے ماتھے پر تلک لگایا ۔ میرے ماتھے پر تلک لگایا ۔ بولا ۔

"تم دیوی ہو ۔ چاندنی تم دیوی ہو"

اور میں نے دادا سے پوچھا ۔

• دادا تم قید کاٹ کر معلوم ہوتا ہے جیل خانے سے نہیں آ کسی پیرس سے آئے ہو ۔ یہ کیا گڑبڑ ہے ۔ یکدم سیٹھ معلوم ہوتے ہو ۔ ایک بہت بڑے سیٹھ ۔"

• ارے سالے بابو تم اکھا بنڈل ہے ۔ اپن کا پانچ لاکھ لاٹری نکل آیا ہے ۔" دادا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

• ادھر اپن سالا جیل سے نکلا ادھر اپن کا لاٹری نکل آیا ۔"

• لاٹری ۔"

• ہاں ۔ پونا ڈربی لاٹری ۔ پانچ لاکھ کا پہلا انعام ۔"

• سمجھ گیا ۔"

"لگی نمبر پانچ۔" دادا نے ایک پُر زور قہقہہ لگایا اور بولا۔

"اب اپن سالا ایک فلم بنائے گا۔"

"فلم؟"

"ہاں۔ شو ندر سا فلم۔ کہانی منچھی بچھیل لکھے گا۔ تم ہیرو۔ چاندنی ہیروئن۔ اپن سالا ریلن۔ دھڑن تختہ۔"

"اور اس کہانی کا نام کیا ہو گا؟"

"رنجو دادا پرنس آف چوپاٹی۔"

"اور کہانی کیا ہو گی۔"

"تمہاری اور چاندنی کے پیار کی کہانی۔"

"فلمی کمپنی کا نام کیا رکھو گے؟"

"مزدور فلم کمپنی۔"

"اور دولت کتنی لگاؤ گے اس فلم پر؟"

"تین لاکھ۔"

"اور بقایا دو لاکھ؟"

"پچاس ہزار میں تمہارا اور چاندنی کا شادی کریں گا۔"

"اور تم اپنی شادی؟"

"اپن شادی نہیں کریں گا سالا۔"

"کیوں؟"

"اپن کا پیار مر گیا۔ اپن سالا مر گیا۔ اپن جندا مالم ہوتا ہے پر اپن سالا جندا نہیں ہے۔"

"یہ تمہارے پیار کی کہانی ہے دادا؟"

"یہ اپن سالا جیانی نہیں بتائیں گا۔ تمہاری پریم کہانی میں اپن سالا اپنی پریم کہانی بھی لکھائیں گا۔ منجھی بچپل سے فلم میں۔"

"اور بقایا ڈیڑھ لاکھ روپے سے کیا کروگے دادا؟"

"پچاس ہزار کسی یتیم خانے کو دیں گا۔ اناتھ آشرم کو دیں گا۔"

"اور بقایا ایک لاکھ روپیہ؟"

"اس کا اپن گلچھرے اڑائیں گا۔"

"تم بھی دیوتا ہو دادا۔"

"ارے ناہیں ناہیں بنڈل بابو۔ اپن سالا ابھی انسان بھی ناہیں بنا۔ اپن دیوتا بننا ناہیں مانگتا۔ انسان بننا مانگتا۔"

اور رنجو دادا میرے پاس ہی بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

"او دیکھو بنڈل بابو اپن نے ایک کار بھی لے لیا ہے پچیس ہزار میں۔"

"کہاں ہے کار؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر ہسپتال کے گیٹ کے پاس کھڑا ہے۔" رنجو دادا نے گفتگو

جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پالی ہل پر ایک بنگلہ بھی کرایہ پر لیا اپن سالے نے۔ اُدھر اپن کا فلمی دفتر نہیں۔ اور اپن تینوں سالا لوگ بھی ادھر ہی رہیں گا۔"

"بہت ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

نرس چپ چاپ کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اب دادا اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"دیکھو میم صاحب۔ ادھر اپن کے آدمی کو بولو۔ ڈرائیور کو بولیں گا۔ ادھر کمرے سامنے ڈیڈی بیں کھڑا کرے۔ اور ساری چیزیں ادھر کمرے میں لائیں۔ جب تک اپن کا بابو سالا ٹھیک نا ہیں ہوئیں گا اپن ادھر رہیں گا۔"

نرس چلی گئی تو اب رجو دادا پھر مجھ سے کہنے لگا۔

"زندگی تم کو چاندنی دیوی نے دیا۔ پاور تم کو اپن سالا دیں گا۔ بڑا بڑا کچھ کھلائیں گا۔ اپنی کا گاڑی میں تم سالا کو رکھا کر کلاک کے سمندر کے کنارے گھمائیں گا۔

تم سالا دنوں میں سینڈو بن جائیں گا۔ یہ موافق" دادا نے گلے اور پیٹ پھلا کر سینڈو کی شکل بنائی تو ہم سب ہنس دیے۔

اتنے میں دادا کا نوکر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بہت سی چیزیں